گل متی

شمالی علاقہ جات کی لوگ کہانیاں

روبینہ امتیاز قزلباش

فہرست

روبینہ کا کمال فن	02
گل متی	07
بچہ خور	19
رڑا گاسس	40
ہپر نگ کور	55
پڑری کی محبت	86
بینگ گری	118
خامر اور خورد	145

www.Nayaab.Net
انٹرنیٹ ایڈیشن دوم سال 2006

روبینہ کا کمالِ فن

میں نے ''ادبِ لطیف''، ''سویرا''، ''نقوش''، ''امروز'' اور ''فنون'' کے توسط سے بے شمار شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں کو ادبی دنیا سے متعارف کرانے کی مسرت حاصل کی ہے۔ یہ ان پر میرا کوئی احسان نہیں تھا۔ یہ تو میری طرف سے ان کے جوہرِ تخلیق کا اعتراف تھا۔ ان میں سے چند گنے چنے نام ہی ایسے ہیں جنہوں نے اپنی ابتدائی فنی تخلیقات ہی سے شعر و ادب کے قارئین کو چونکا دیا اور جو امتدادِ زمانہ اور کروہاتِ حیات کی زد سے بچ کر نکلنے اور اپنے فن کو مسلسل ارتقا پذیر رکھنے میں کامیاب رہے۔ محترم روبینہ امتیاز قزلباش انہی معدودے چند اہلِ قلم کے گروہ میں شامل ہیں۔

روبینہ ایک لحاظ سے میری دریافت ہیں۔ وہ آج سے چند برس پہلے، کسی رسمی تعارف کے بغیر میرے ہاں تشریف لائیں اور بڑی بے تکلفی سے بتایا کہ انہیں اردو نہیں آتی، اور اگر میں ان کی اردو درست کرنے کا وعدہ کروں تو ان کے پاس پاکستان کے شمالی علاقوں کی لوک کہانیوں اور لوک ادب کا ڈھیروں مواد موجود ہے۔ وہ یہ کہانیاں پورے پاکستان کو سنانا چاہتی ہیں تاکہ لوگ اپنے وطن کے ان دور افتادہ اور دشوار گزار علاقوں میں بسنے والوں کے دکھ سکھ سے نہ صرف متعارف ہو سکیں بلکہ شرکت کی بھی کوئی سبیل نکالیں۔ ساتھ ہی انہوں نے بتایا کہ ''مارشل لائی'' آمریت کی اس دور میں ان کہانیوں کے پس منظر میں پاکستان کے عوام الناس کے زبوں حالی اور زبان بندی کی الم ناکی کو بھی واضح کیا جا سکے گا اور مطلق العنانی کے کتنے ہی گھناؤنے گوشے حقیقت کی دھوپ میں عریاں ہو جائیں گے۔

روبینہ صاحبہ کی گفتگو میں جس ذوق وشوق اور جس نیک نیتی اور خلوص کی فراوانی تھی، اس نے مجھے اِن سے یہ کہانیاں لکھ ڈالنے کی فرمائش کرنے پر مجبور کر دیا پھر جب مجھے ان کی پلی کہانی۔ ''گلی متی'' --- کا مسودہ ملا تو میں نے مدیر کی سرخ پنسل ہاتھ میں لے کر اسے نک سک سے درست کرنے کے ارادے سے اس کا مطالعہ شروع کیا مگر اس پنسل کو آخر تک مسودے پر جھکنے کی توفیق نہ ہوئی۔ میرے کانوں میں ''گل مُتی'' کی فریاد ----- اس کا ''بگا'' مسلسل گونج رہا تھا۔ وہ مظلوم گلی متی جس کا ''بگا'' آس پاس کے تمام پہاڑوں اور وادیوں میں گونجتا پھر اگر جابر حکمران کے خوف سے کوئی بھی گل متی کی مدد کو نہ پہنچ سکا اور وہ غار میں داخل ہو کر وہاں سے اس لئے کبھی باہر نہ آئی کہ اسے بے غیرتوں کے ہجوم میں جینے سے نفرت تھی۔

اس کہانی کی ''اردو درست کرنے'' کا موقع بہت بعد آیا جب میں اس کہانی کی گرفت سے نکلا۔ یہاں وہاں زبان کی معمولی فروگزاشتیں ضرور تھیں ورنہ روبینہ امتیاز قزلباش نے یہ کہانی اتنی دل آویز سلاست اور اتنی روانی بے ساختگی سے لکھی تھی کہ اگر یہ واقعی ان کی پہلی اردو تحریر تھی (اور مجھے ان کے ارشاد پر شبہ کرنے کو کوئی حق حاصل نہیں ہے) تو یہ تحریر اس لحاظ سے حیرت انگیز تھی کہ اظہار میں کسی نوع کا تکلف برتنے کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی کیونکہ اُنہیں تخلیق ادب کا کوئی دعویٰ نہیں تھا۔ وہ تو صرف ایک ایسی کہانی سنا رہی تھیں جو انہوں نے شمالی علاقوں کی سیاحت کے دوران، وہاں کے سیدھے سادے لوگوں کی زبانی سنی تھی۔ قدرت کی طرف سے انھیں کہانی سنانے کا جو سلیقہ ودیعت ہوا ہے، اس نے ان کی تحریر میں ایک طلسم سا بھر دیا تھا اور اس سنی سنائی کہانی کی ''رپورٹنگ'' تخلیقی ادب کا منصب ادا کر رہی تھی۔ تب میں نے مصنف کو واضح الفاظ میں کہ دیا کہ اگر آئندہ کہانیوں میں بھی

اپنے موضوع پر آپ کی گرفت ایسی ہی مضبوط اور طلسماتی رہی، تو یقین جانیے کہ آپ پاکستان کے لوک ادب میں ایک نا قابل فراموش کارنامہ انجام دینے والی ہیں۔

''گل مُتی'' کے بعد ''پرڑی کی محبت''، ''رڑا گاسس''، ''بچہ خور''، ''ھپر نگ کور''، ''بیسنگ گری''، ''خامر اور خورو'' ----یہ کہانیاں پے در پے شائع ہوئیں تو قارئین ادب محسوسات کے ایک عجیب تجربے سے گزرے۔ ''بیسنگ گری'' کے ظالم ''بھتم'' میں انہوں نے اپنی تاریخ کے کتنے ہی جابروں کو منعکس دیکھا۔ ''ھپر نگ کور'' میں راجہ کی رعایا نے متحد ہو کر جس طرح راجہ کو علاقے کے ایک قدیم ہولناک دستور کو موقوف کرنے پر مجبور کر دیا اس کے نتیجے میں انیسویں صدی کے وسط میں ایک یورپین نے لکھ کہ ان دور دراز پہاڑوں میں یہ پس ماندہ علاقہ، جو باہر کی تہذیب اور تعلیم یافتہ دنیا سے الگ تھلگ ہے، سیاسی طور پر کتنا ترقی یافتہ ہے۔ یہاں کا طرز حکومت جمہوری ہے۔ یہاں باقاعدہ انتخابات ہوتے ہیں۔ اس میں عورتیں بھی منتخب ہو سکتی ہیں چنانچہ وادی چیلاس کے ان چھوٹے چھوٹے دیہات کو ۱۸۶۶ء میں جو سیاسی حقوق حاصل تھے وہ برصغیر کو برطانوی راج میں بھی نصیب نہیں تھے۔ ''ھپر نگ کور'' اور ''بچہ خور'' میں عوام الناس جس عزم کے ساتھ جبر کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اس سے فرمانروائی کی فصلیں تڑخ جاتی ہیں اور آمریت کے زرہ بکتر کڑی کڑی ہو کر بکھر جاتے ہیں۔ ''رڑا گاسس'' میں بھی عورتوں کا بھوکا راجہ جب دیکھتا ہے کہ اس کے علاقے کی تمام عورتیں ہجرت کر گئی ہیں تو وہ ذلت کی انتہا پر پہنچ کر اپنی ہی بہن کو ہوس کا ہدف بنانے اس کا تعاقب کرتا ہے۔ تب مجھے ایک بار پھر ''گل متی'' کا وہ ''بگا'' سنائی دیتا ہے جو آج بھی اُس وقت گونج گونج اُٹھتا ہے جب کوئی

زبردست کسی زیردست پر جھپٹتا ہے۔

ان سے کہانیوں نے روبینہ امتیاز قزلباش سے متعلق میرے اس ابتدائی اندازے کو حرف بحرف صحیح ثابت کر دیا کہ یہ خاتون ہمارے لوک ادب میں ایک نا قابل فراموش اضافہ کرنے والی ہیں۔ قارئینِ ادب نے اہم آواز ہو کر یہ فیصلہ دیا کہ اردو میں روبینہ کی آواز ہر لحاظ سے منفرد ہے اور اس مصنفہ نے شمالی پاکستان کی چند کہانیاں سنا کر پورے ملک کو اپنے اِن دور افتادہ ہم وطنوں کا نہایت قریب سے تعارف کرا دیا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے ان کہانیوں کو استعارے بنا کر تمام پاکستان کو جبر، ظلم، استحصال اور استبداد کے خلاف متحد ہو کر زندگی کو آسان اور انسان کو باوقار بنانے کی جس سلیقے سے ترغیب دی ہے۔ وہ کچھ انہی کا حصہ ہے۔

یاد رہے کہ یہ کہانیوں پاکستان پر مسلط گیارہ سالہ آمریت کے دور میں لکھی اور شائع کی گئیں۔ مصنفہ نے ان کہانیوں کو بطور علامت استعمال کر کے اپنے پڑھنے والوں کو آمریت سے گلوخلاصی حاصل کرنے اور مطلق العنانیت کو جمہوریت میں بدلڈا لنے پر اکسایا اور یہ تحریک "بیسنگ گری" میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی جب جابر بادشاہ۔ تھم۔ جو عظمت وقوت کی علامت ہے، بھول جاتا ہے کہ جن لوگوں پر وہ حکمران ہے، ان کے بھی احساسات ہوتے ہیں۔ وہ بھی سوچتے ہیں۔ انہیں بھی غصہ آ سکتا ہے اور جب ایک کے مقابلے میں ہزاروں کو غصہ آ جائے تو آمریت کے سامنے صرف فرار کی راہ باقی رہ جاتی ہے۔ لوگ "تھم" کے حکم پر پتھر ڈھونے میں اپنی زندگیاں ویران کر رہے ہیں تو ایک بیوی اپنے شوہر سے کہتی ہے۔ "مرنا تو یوں بھی ہے۔ مرنے سے پہلے ایک آدھ پتھر اس تھم کے سر میں مار کر مرو تو جب جانوں"۔ "تھم" کا زعم ٹوٹتا ہے۔ اس کی قہر آلود انا کا خول چٹختا ہے اور آخری فتح اس گروہ کو حاصل ہوتی ہے

جسے حکمرانوں کی زبان میں رعایا اور تاریخ کی زبان میں عوام کہتے ہیں۔

روبینہ امتیاز قزلباش کی ان کہانیوں میں اکثر اوقات غیر حقیقی عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے کہ آخر یہ لوک کہانیاں ہیں اور عوام الناس اپنے دکھوں کی کاٹ کو کم کرنے کے لئے عموماً اس طرح کی مابعد الطبیعیاتی اور ماورائی پناہ گاہوں کے متلاشی رہتے ہیں مگر روبینہ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ہر غیر حقیقی صورت حال کو حقیقت کے ادراک کا ذریعہ بنا دیا ہے اور یوں یہ کہانیاں نہ صرف ہمارے تخلیقی ادب کا ایک اہم حصہ ہیں بلکہ پاکستان کے شمالی گوشے کی تاریخ، تہذیب اور ثقافت پر سے بھی پردہ ہٹاتی ہیں اور ہمیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ انسان صرف اسلام آباد، کراچی، لاہور، پشاور اور کوئٹہ میں نہیں بستے، شمال کے دور دراز پہاڑوں اور برف سے ڈھکی ہوئی وادیوں میں جو مخلوق آباد ہے، وہ بھی آدم ہی کی اولاد ہے، اس کے بھی بعض مسائل ہیں اور بعض حقوق ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ نہ ہم نے ان کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور نہ ان کے حقوق پورے کرنے کے بارے میں سوچا ہے۔ روبینہ امتیاز قزلباش نے ان کہانیوں میں ہمیں جو آئینے دکھائے ہیں، ان میں اگر ہم آنکھیں کھول کر جھانکیں اور اپنی شناخت کے قابل ہو جائیں تو مصنفہ کو اس کی محنت کا ثمر مل جائے گا۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۸۹ء (لاہور)

احمد ندیم قاسمی

گل متی

پہاڑوں اور ان کی وادیوں میں بسنے والوں کے درمیان محبت اور شفقت کا ایک عجیب رشتہ قائم ہے جو صدیوں سے چلا آرہا ہے ۔ پہاڑ اپنی وادیوں کی حفاظت کرتے ہیں ۔ ندی نالوں کا منہ کھول دیتے ہیں وج وادیوں میں اُگے ہوئے درختوں، جانوروں اور کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں ۔ ان کے تیز جھرنوں پر جندر آٹا پیستے ہیں ۔ سردیوں میں انھیں جنگلوں کے دم سے گرمی میسر آتی ہے ۔ چیل کی چھوٹی بالیاں گندے بروزے سے بھرپور "دیئی" کا کام دیتی ہے جو اندھیری راتوں میں مشعلیں بن کر مشکل پگڈنڈیوں پر چلنے والوں کا راستہ منور کرتی ہیں ۔

پہاڑوں کی اونچی دیواروں اور وادیوں کی تنگی، انسانی آواز میں ایک ایسی گونج پیدا کردیتی ہے جو وائرلیس اور ٹیلی فون کے بغیر زور کی ایک پکار کو ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک پہنچا دیتی ہے ۔ اس طرح اچانک حادثوں کی اطلاع ہر طرف گشت کر جاتی ہے ۔ زور کی اس پکار کو پہاڑی "بُگا" کہتے ہیں ۔ پہاڑی معاشرے میں اچھا اور واضح "بُگا" دینے والے کی بہت قدر ہوتی ہے ۔ ضرورت کے وقت اس کو کہا جاتا ہے کہ "بُگا" دے کر قریب کے گاؤں کو اطلاع کردے ۔ ایک گاؤں سے "بُگا" دوسرے گاؤں کو دیا جاتا ہے ۔ اس طرح ایک ہی دن میں بہت سے گاؤں کو اہم خبر مل جاتی ہے ۔

پاکستان کے ان پہاڑوں کی زندگی صدیوں سے ایک سی ہی ہے، ان کی سوچ، ان کا اخلاق، ان کا رہنا سہنا، ان کے اوزار، خوراک، لباس، رسم و رواج، آج بھی ویسے ہی ہیں جیسے صدیوں قبل تھے ۔ ان کا وجود بیسویں صدی میں ہو کر بھی بیسویں صدی

میں نہیں ہے اور اگر معاشرتی نفسیات کے ماہرین انھیں اپنی توجہ کا مرکز بنائیں تو انتہائی دلچسپ معلومات فراہم ہو سکتی ہیں۔

پہاڑی اپنے پہاڑوں کی قدر کرتے ہیں۔ وہ ان کی بلند چوٹیوں کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے حُسن کی تعریف کرتے ہیں، ان کے نظروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وہ پہاڑوں کی اونچی چوٹیوں پر کبھی قدم نہیں رکھتے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ پہاڑ پاک ہیں۔ انھیں انسانی قدموں سے ناپاک کرنا گناہ ہے۔ پہاڑ ایسے گناہگار سے خفا ہو جاتے ہیں اور اپنا بدلہ ضرور لیتے ہیں۔

جب بیرونی ممالک اور پاکستان کے ترقی یافتہ علاقوں سے کوہ پیما یہاں آتے ہیں تو وہ ان باشندوں کو کتنا ہی لالچ کیوں نہ دیں وہ ایک مخصوص بلندی کے بعد سامان آگے لے جانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ''ہمیں گنہگار نہ کرو، اگر ہم یہ گناہ کر بیٹھے تو پہاڑ ہم سے بدلہ لیں گے''

انہی پہاڑیوں کے بیچوں بلتستان کا علاقہ ہے جس کی وسط میں وادی گلگت ہے۔ برسوں قبل وادی گلگت ایک چھوٹی سے ریاست تھی۔ اس پر ''راجہ حکومت کرتے تھے۔ یہ راجے مصیبت، قحط غربت، بیماری اور ان آفات کے سدباب کی سی ذمہ داریوں سے واقف نہ تھے۔ انھوں نے اپنا رشتہ دیوتاؤں سے جوڑ رکھا تاھ اور ان کے حوالے سے باشندوں میں خوف و ہراس پھیلا کر اطمینان سے راج کرتے تھے۔ انسانوں سے بلند اور دیوتاؤں سے قریب - یہ راجہ اپنی مرضی کے مالک تھے۔ ان کے لئے زندگی کا مقصد اپنی ہر خواہش کو تکمیل تک پہنچانا تھا۔ جائز و ناجائز، عدل و ظلم، ہمدردی و بے تعلقی، انسانیت و وحشت، ان میں تفریق و امتیاز سے وہ عاری تھے۔ راجہ ہونے کے ناتے سے وہ اپنے آپ کو ان اخلاقی مطالبات سے بالاتر سمجھتے

تھے۔وادی اُن کے لئے بازی گاہ تھی اور گلگتی اُن کی سہولت کا ایک ذریعہ۔وادی کے لوگ برسوں سے اُن کے ظلم کا شکار تھے مگر زندگی کی اس طرز کو دیوتا کی مرضی سمجھ کر ہر ظلم سہنے کے عادی ہو چکے تھے۔

مردانگی، عزم، کمال۔یہ سب صلاحتیں اُن میں موجود تھیں جو اُن کی زندگیوں کے باقی پہلوؤں میں اظہار پاتیں۔مگر راجہ کے خلاف قدم اٹھانا اُن کی سوچ میں داخل ہی نہ ہوسکتا تھا۔اُن کے لئے یہ ایک دیوتائی معمہ تھا جو ان کی سمجھ سے باہر تھا۔کبھی کبھار کوئی راجہ اتفاق سے، انسان دوست نکل آتا تو یہ لوگ اسے دیوتا کی عنایت سمجھتے اس راجہ کی انسان دوستی میں پہلے راجہ کے مظالم بھول جاتے۔خوش اور مطئین زندگی گذارتے۔زیادہ اطاعت گذار ہو جاتے۔کبھی کبھار کے یہ خوشگوار حادثے، اُن کی دلوں میں ڈھلتی ہوئی نفرت کی کڑی توڑ دیتے۔اس طرح یہ کڑیاں ایک ایسی مضبوط زنجیر میں نہ بدل پاتیں جو اس مسلسل استبداد کو اپنے گھیراؤ میں لے کر اس کو ہمیشہ کے لئے جکڑ کر ختم کر سکے۔جہالت کے شکار یہ اچھے لوگ اپنی سوچ کے اس زاویے کو نہ بدل سکتے تھے۔راجہ جیسا بھی ہوتا۔دیوتا کا اوتار تھا اور انھیں اس کا راج سہنا ہی پڑتا۔

جب جیپ رکی تو ایک عجیب منظر تھا۔صاف، شفاف، تیزی سے بہتا ہوا نالہ "کار گاہ"۔اس کے دائیں کنارے پر سنگلاخ چٹانیں سورج کی روشنی روکے، اونچی مغرور کھڑی ہیں۔بائیں طرف بجری اور پتھروں کا محدود ساحل، پھر تنگ سا راستہ اور ایک اور پہاڑ جس پر اکا دکا جھاڑیاں چند چیل کے درخت اور بس۔وادی گلگت کے جنوبی نکڑ پر، جہاں بسین ختم ہوتا ہے۔یہ ایک عجیب سی تنگ سی وادی ہے۔یہاں دن

کو بھی شام کا سماں رہتا ہے۔نالے کے شور اور اس کی گونج سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔

ہم ٹراؤٹ کے شکار کو آئے تھے۔راستہ نالے کے ساتھ ساتھ رواں تھا۔تنگ وادی تنگ تر ہوتی چلی جارہی تھی۔شام، گہری شام میں بدل رہی تھی۔دائیں جانب چٹانیں اور بائیں جانب چٹانیں اور بائیں جانب پہاڑ بلند تر ہوئے جا رہے تھے، عجیب سی گھٹن اور ویرانی کا احساس ہو رہا تھا۔نالے کو شور جیسے وادی کی سب آوازوں کو دبائے ہوئے تھا۔''کوئی نہ آئے،کوئی نہ جائے، کچھ نہ سنائی دے''- تنگ وادی یہی انداز لئے بڑھتی چلی جارہی تھی۔

میں رُک گئی۔''آگے کیا ہے؟''میں نے پوچھا۔

''گل متی''،گلگتی بولا۔

''گل متی؟یہ کون ہے؟''

''ایک لڑکی تھی۔''

''یہاں کیا کرنے آئی تھی؟''

''اپنے پہاڑ کی گود میں پناہ لینے۔''

''مجھے بتاؤ گلگتی۔یہ کیا واقعہ ہے؟''

میرا تجسس مجھے آگے لے گیا۔ہم بڑھتے گئے۔وادی تنگ ہوتی گئی اور پہاڑ بلند تر۔ اب راستہ ایک پگڈنڈی میں سمٹ چکا تھا۔کارگاہ کی پر جوش لہریں ہمارے ٹخنوں سے

ٹکرا رہی تھیں۔ جیسے ہمیں آگے جانے سے روک رہی ہوں۔شام گہری ہو چکی تھی۔ بہت دور آسمان روشن تھا تو سہی مگر اُس کی روشنی نیچے پہنچ نہ پا رہی تھی۔ پہاڑ چٹانوں کی طرح ننگا تھا۔اب تو اس پر جھاڑی کیا، گھاس تک نہ تھی۔بھر بھری مٹی اور پھسلتے پتھر، یہاں پہنچ کر گلگتی رُک گیا۔اُس کا رُخ پہاڑ کی طرف تھا۔اس کے چہرے پر دکھ اور ندامت کا ہلکا سا تاثر تھا۔پہاڑ کے وسط میں ایک بڑا سا غار دکھائی دیا۔اس کا دہانہ کھلا تھا اندر سیاہ اندھیرا تھا۔غار کے منہ پر ایک بڑا سا پتھر رکھا تھا جیسے لڑھکنے کو تیار کھڑا ہو، "یہاں گل متی نے پناہ لی تھی۔" وہ ڈری ڈری آواز میں بولا۔

"کیوں؟"

"پرانی بات ہے بی بی،" گلگتی نے ایک لمبا سانس لیا۔پھر اس نے بتایا کہ جس راجہ کا یہ دور تھا، وہ بے انتہا مغرور، ظالم اور بدتھا۔دنیا کی ہر بُری عادت اس میں تھی۔بہت شراب پیتا، بہت خوراک کھاتا، بہت سوتا، غسل کبھی کبھار کرتا۔غصہ جنون کی حد تک تھا۔اس حالت میں اکثر قتل کرا دیتا۔پچھتاوا نام کی کسی چیز سے واقف نہ تھا۔جو کر بیٹھا۔سو کر بیٹھا عقل سے عاری جھوٹ اور سچ کی تمیز سے بے، بہر، معاشرے کی مروجہ قدروں کا کھلّم کھلّا مذاق اُڑاتا تھا۔انسان اس کے لئے کھلونے تھے۔اور ان کی زندگیاں اس کی ذاتی سہولتیں تھیں۔آخر وہ دیوتائی قوت کا حامل جو تھا۔گلگتی بہت ہی تنگ آئے ہوئے تھے۔وادی میں غم اور مایوسی کا دور دورہ تھا۔لوگ ضرورت سے زیادہ مشقت میں کھو کر اس مشکل وقت کو گذارنے کی کوشش کر رہے تھے۔دعا کرتے رہتے کہ راجہ کسی حادثہ کا شکار ہو جائے۔تاکہ کم از کم اُن کی اولاد تو اُس کے عتاب سے محفوظ رہ سکے۔وادی میں عورتیں مردوں کے دوش بدوش کھیتوں میں ہمیشہ سے کام کرتی چلی آتی تھیں۔مگر اب انھوں نے منہ چھپانا اور محتاط رہنا شروع

کر دیا۔ کسی کی عزت محفوظ نہ تھی ۔راجہ کو جو بھا گئی سو اُسے اُٹھا کر چلتا بنا۔ پھر بعد میں وہ بے چاری، شرم کی ماری، کبھی اپنے گھر والوں کے پاس واپس نہ آسکتی ۔ اسے دریائے ہنزہ میں پناہ ملتی ۔ کتنے ہی گھر اس المیے کا شکار ہو چکے تھے۔

گل متی ایک غیر معمولی شخصیت تھی ۔ بچپن سے ہی وہ نیک اور پاک تھی ۔ شکل و صورت کی بے انتہا خوبصورت ۔ گاؤں کے سب لوگ اُس سے محبت کرتے تھے، اور اُس کی نرم طبیعت کی وجہ سے اُس کی قدر کرتے تھے ۔ بزرگ اُس کو دعا دیتے تھے ۔ نوجوان اُس کی پانے کا ارمان دل میں لئے مشقت کرتے تا کہ کچھ دکھائیں اور گل متی کے قابل ہو سکیں ۔ وہ صرف اپنے ماں باپ کی ہی نہیں، سارے گاؤں کی بیٹی تھی ۔ ہمدرد، حساس، مہربان اور حسین ---!

سیاہ لانبے بال، گلابی اور شفاف رنگ، بڑی بڑی حساس سرمئی آنکھیں، گھنی لانبی پلکیں ۔ دراز قد، سڈول جسم، پتلی کمر، نازک ہاتھ اور پاؤں، لانبی انگلیاں، قدرت نے اُسے خاص توجہ سے بنایا تھا۔ جب پانی بھرنے جاتی تو عورتیں بھی اُسے دیکھ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکتیں ۔ وہ سب کے اندر پیارا کساتی تھی ۔ سب کی مدد کو تیار، سب کی عیادت کو رضامند، دکھ سکھ بانٹنا اُس کی فطرت تھی ۔ لوگوں کے چہرے اُسے اُن کے دلوں کی کیفیت بتا دیتے اور بغیر کچھ پوچھے وہ اُن کی مدد کو پہنچ جاتی ۔ کسی کو تسلی کا لفظ، کسی کے لئے پر امید جملہ، کسی کو خاموش رفاقت، جو بن پڑتا کر گزرتی ۔ نوجوانوں کی مجلسوں میں اُس کا ذکر ہوتا ۔ ''گل متی چاہیے تو کچھ بن کر دکھاؤ!'' وہ اُن کے لئے مردانگی، عزم اور کمال کا محرک تھی ۔

گل متی ان کی زندگیوں میں ایک حسین واقع تھی!

اُس دن ایک بہت ہی حسین شام تھی۔ دریائے گلگت آہستہ آہستہ رواں تھا،سنہری سورج سرمیلے پہاڑوں کی اوٹ سے جھانک رہا تھا۔اس کی زرد کرنیں لہروں سے کھیل رہی تھی۔ دھندلکوں میں وادی بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ ہر چیز کا رنگ گہرا ہو گیا تھا۔درخت، پتے، کھیت، گھاس پتھر اور دریا کی لہریں، سبھی خاموش اور پرسکون تھی۔فصلیں ابھی کمسن تھی۔ان کی سبز کونپلیں دھیرے دھیرے سرسرا رہی تھی۔کام کرنے والے کبھی کے گھروں کے جا چکے تھے۔کھیت خالی تھے رات ہونے سے پہلے سب ضرورتوں سے فارغ ہونا چاہتے تھے۔گلگتی چراغوں کی روشنی میں کام کرنے کے قابل نہ تھے۔

گلی متی بھی کام ختم کرنے میں ماں کی مدد کر رہی تھی۔پھر اُس نے دیکھا کہ گھر میں پانی نہ تھا۔رات کو پیاس لگی تو کیا ہوگا۔بوڑھی ماں کو چشمہ پر جانا پڑے گا۔آج اُس نے بہت کام کیا ہے۔تھک گئی ہے۔کیوں نہ میں ہی جلدی سے پانی لے آؤں، چشمہ نزدیک ہی تو ہے۔

اُس نے جلدی سے گھڑا اٹھایا۔"آئی ماں۔میں بس ابھی آئی۔"اُس نے کہا اور جواب سنے بنا چلتی بنی۔ابھی وہ کچھ دور ہی گئی تھی کہ اُسے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔گل متی نے سوچا"اگر راجہ ہوا تو! اے دیوتا میری مدد کر!"

ابھی اُس کے قدم رکے ہی تھے کہ گھوڑسوار سر پر پہنچ گیا۔گل متی نے نگاہیں اٹھائیں۔سوار راستہ روکے اُسے گھورے چلے جا رہا تھا۔اس کی مست آنکھوں سے غلیظ جذبات عیاں تھے۔صورت مکروہ تھی،جسم موٹا اور بھونڈہ۔گل متی گھڑا ہاتھ میں لئے بے خوف اُس کا جائزہ لے رہی تھی اور سوچ رہی تھی---"اس میں تو دیوتاؤں والی کوئی بات ہی نہیں۔یہ تو انسان کی بھی گری ہوئی شبیہہ ہے---وادی کے سب

لوگ اس سے خوفزدہ ہیں! آج تک! آخر کیوں؟"

گل متی نے راجہ کو پہلی بار دیکھا تھا، "یہ بدمست! کریہہ صورت! یہ کمزور آدمی! اور پھر ہمارا راجہ!!!" اُس کا ذہن تیزی سے گھوم رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی نفرت راجہ کو نظر نہ آ رہی تھی۔ وہ تو اس کے حسن کو دیکھے چلا جا رہا تھا۔

"میرا راستہ چھوڑ دو، مجھے پانی لینے جانا ہے" ۔گل متی نے دبدبے سے کہا۔ راجہ ایک دم چونک پڑا۔ وادی کی کوئی لڑکی آج تک اُس سے یوں مخاطب نہ ہوئی تھی۔ اکثر تو اسے دیکھتے ہی بے ہوش ہو جاتیں۔ وہ گھوڑے سے اترا۔ ایک ہاتھ سے باگ سنبھالی اور دوسرا ہاتھ گل متی کو دبوچنے کے لئے آگے بڑھایا۔ گل متی نے غضبناک ہو کر گھڑا اُٹھایا اور پوری قوت سے راجہ کے دے مارا۔ راجہ پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ گھڑا جا گھوڑے کے منہ پر لگا۔ گھوڑا بدکا اور باگ چھڑا کر بگٹٹ بھاگ ہوا۔ راجہ ذرا سی دیر کے لئے لڑکھڑایا پھر فوراً ہی سنبھل گیا۔ "اس چھوکری کی یہ مجال!" اس نے سوچا۔

گل متی بھاگ کھڑی ہوئی۔ آگے آگے وہ تھی اور پیچھے راجہ۔ گل متی دوڑتی چلی گئی۔ کھیتوں سے ان کے "اَٹ" پھلانگتی، راستوں سے، پگ ڈنڈیوں سے ۔۔۔۔ ۔اُس نے مدد کے لئے کسی کو نہ بلایا۔۔۔۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ لوگ میری کیا مدد کریں گے جو برسوں سے، راجاؤں کے سامنے بے بس ہیں۔

میں پہاڑوں سے مدد مانگوں گی۔ میں آخر انکی بیٹی ہوں۔

گلی متی بھاگتی چلی گئی۔ وادی تنگ ہوتی گئی۔ نالے کا شور بڑھتا گیا۔ شام، گہری شام میں بدل گئی۔ گل متی کے قدم نہ رُکے۔ آگے آگے وہ تھی اور تعاقب میں راجہ۔

یہ موذی مجھے ہاتھ نہ لگائے۔۔۔اس کا غیرت مند عزم کہہ رہا تھا۔

پھر وہ پکاری ''کوئی ہے؟ کوئی قدرت؟ کوئی عظمت؟ جو مجھے بچالے۔ میں اسے اپنی عزت کا واسطہ دیتی ہوں!''

وادی اتنی تنگ ہوگئی کہ آگے بڑھانا مشکل تھا۔نالے کا شور اتنا بڑھ گیا کہ گل متی کو اپنے اکھڑے سانسوں کی آواز بھی سنائی نہ دے رہی تھی۔تعاقب میں راجہ تھا۔ آگے راہ محدود تھی۔ دائیں طرف نالہ تھا---گل متی نے بائیں طرف کی چٹیل پہاڑ پر چڑھنا شروع کردیا۔

وہ پہاڑ پر چڑھتی گئی۔

راجہ لپکتا ہوا اُس کے پیچھے آرہا تھا۔

گل متی کو یوں لگ رہا تھا جیسے اُس کا دل پھٹ کر منہ میں آنے کو ہے۔

مگر وہ بڑھتی چلی گئی۔

راجہ بہت قریب آچکا تھا۔

یہ یہ یہ یا پہاڑ!! گلی متی'' کا بگا'' بلند ہوا اور ایک مسلسل گونج بن کر پہاڑوں سے ٹکراتا، وادی کے کونے کونے میں دور تک پھیلتا چلا گیا۔

لوگ گھبرا کر گھروں سے نکل آئے اور کارگاہ کی طرف لپکے۔اُن کا ہجوم تنگ وادی میں گھستا چلا گیا۔اُن کے ہاتھوں میں ''دینیوں'' کی روشنی تھی جو ان کی تنگ راہ کو منور کررہی تھی۔وہ ایک دوسرے کے پیچھے تیزی سے مگر خاموش رواں تھے۔

گل متی کے ''بگھے'' کی گونجیں اب بھی اُن کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ کسی کو کچھ معلوم نہ تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ تجسس انھیں کھینچے لئے آ رہا تھا فکر و اندیشہ سے اُن کے دل دھڑک رہے تھے۔ کوئی کسی سے نہ پوچھ رہا تھا۔ سبھی خاموش تیز تیز بڑھتے چلے آ رہے تھے۔

زور کا دھماکے سے راجہ کے قدم لڑکھڑائے۔ وہ گل متی کے دوپٹے کا سہارا لینے کی ناکام کوشش کرتا ہوا گرا، لڑھکا اور پھر لوگوں نے راجہ کو گڑ گڑ گڑ از گڑ از شڑاپ کے ساتھ کارگاہ کی تد موجوں کی نذر ہوتے دیکھا پلک جھپکنے میں پانی برابر ہو گیا۔ کارگاہ کا پانی راجہ کو کھا گیا تھا۔

ہجوم جیسے سکتے میں آگیا۔ کافی دیر تک وہ سب پانی کی تلملاتی سطح کو دیکھتے رہے۔

----کسی کا بھی احساس نہ رہا۔گل متی کی نگاہیں تھیں، وہ تھے، اور بس۔

گل متی انھیں دیکھتی رہی۔ اُس نے اپنے ماں باپ کو دیکھا، اپنی ہمجولیوں کو دیکھا۔ اُن نوجوانوں کو دیکھا جو اُس کے لئے اپنی جان پر بھی فدا ہو سکتے تھے۔ اُس نے اُن کے قدموں کو بھی دیکھا جو لرزتے پہاڑ کے باوجود، اُس تک پہنچنے کے لئے اٹھے تھے مگر اب رُک کر اُس کے حکم کے منتظر تھے۔

اب گل متی کی آنکھوں میں کسی کے لئے رفاقت نہ تھی۔ وہ اُنھیں لاتعلقی سے دیکھتی رہی۔نظروں کے اس ملاپ میں جیسے مدتیں گذر گئیں۔ پھر اُس نے منہ موڑا اور غار کے اندر اندھیرے میں چلی گئی۔ کچھ لمحوں تک غار کے دہانے پر اُس کی لہراتی زلفوں کا گمان رہا۔پھر وہ بھی گم ہو گیا۔

گل مُتی ان سب سے منہ موڑ کر غار کے اندھیروں کو اپنا چکی تھی۔ یہ اُس کا اٹل فیصلہ تھا۔

کرب اُن کے دلوں کو مسل رہا تھا۔روح کے اندر اتنا درد امنڈ آیا تھا کہ آہ بھی نہ نکل رہی تھی۔ یہ سب کچھ ہوا مگر ذہنوں پر پڑے ہوئے پردے ویسے ہی پڑے رہے۔ کسی نے راجہ کے محل کا رُخ نہ کیا۔ کسی کو بغاوت کی نہ سوجھی۔ غم سب کا مشترک تھا مگر ذہنوں اور ضمیروں کے پردوں کو جنھیں صدیوں نے بُنا تھا کسی نے نہ ہٹایا۔

ان کی گل متی جا چکی تھی۔بس یہ اذیت ناک احساس تھا اور اس کو خاموشی سے سہہ لینے کی ویرانی تھی جو ان کی روحوں کو گھائل کئے دے رہی تھی۔

راجہ کی لاش ڈھونڈھنے پر بھی نہ ملی۔ اُس کا کمسن بچہ گدی نشین ہوا اور راجہ کہلایا۔ لوگوں نے اس کا راج قبول کر لیا اور دعا کی کہ وہ ہمدرد اور انسان دوست ہو۔

''مگر گل مُتی کا کیا ہوا'' میں نے بے قراری سے پوچھا۔

گلگتی حیران رہ گیا جیسے اب اس کے کہنے کے لئے کیا باقی رہ گیا تھا۔ ''بی بی! وہ پھر غار سے کبھی نہ آئی۔ وادی کے لوگ اُس کی ضرورت کی چیزیں غار کے دہانے پر رکھ آتے۔ جن میں سے کچھ وہ کبھی کبھار اٹھا بھی لیتی -----لیکن کسی نے پھر اُس کی جھلک نہ دیکھی۔''

اس طرح برسوں گذر گئے۔ ایک دن ان چیزوں کو اُٹھانے وہ باہر نہ آئی۔ پھر کافی دن اس طرح گذر گئے۔ لوگوں کو تشویش ہوئی۔ کچھ نے اندر جا کر دیکھنے کا ارادہ کیا۔ جس دن وہ غار کے پاس پہنچے آگے یہ بڑا پتھر راستہ روکے کھڑا تھا لڑھکنے کو تیار، وہ سمجھ گئے گل متی مر چکی ہے اور کسی کو اُس کی لاش دیکھنے کی اجازت نہیں۔ ''مگر گاؤں والوں نے اُسے باہر لانے کی کوشش کیوں نہ کی؟''

''بی بی وہ سب بہت شرمندہ تھے۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ گل مُتی پہاڑوں کی آغوش میں اُتر جائے گی مگر ایسے لوگوں میں کبھی رہنا نہ چاہے گی جو صدیوں سے ایسے نظام کہ سہہ رہے ہوں جو انھیں ذلت اور دکھ دے مگر اس کو بدلنے کا ان میں عزم اور حوصلہ ہی نہ ہو۔''

بچہ خور

پہاڑوں کے بیچ وادیوں میں بے چاند راتیں بہت سیاہ ہوتی ہیں۔ چاروں طرف

بلا [illegible]

نی احساس دے رہے تھے جیسے ہم اندھیرے میں گم ہو رہے ہوں۔ ہوا بھی بالکل بند تھی

۔ میں نے کہا ”چلو چچا واپس چلیں“

تا ہم گلگت ہوائی اڈے پر تھے جو خالی تھا۔ یہاں شام پانچ بجے کو بعد کوئی جہاز نہیں اترتا

اتو ۔ چچا مجھے جیپ چلانا سکھا رہے تھے انھوں نے میرے ارادے پر تعجب کا اظہار کیا

۔ میں نے کہا۔ ”نہیں چچا“ میں اندھیرے میں مزید ایک بھی چکر لگانا نہیں چاہتی

۔ جیپ کی اگلی بتیوں کی روشنی ۔سے اندھیرے اور بھی سیاہ لگتا ہے۔ چلو گھر چلیں“

کا ہم پلٹ پڑے ۔ یہ ۱۹۶۲ء کی بات ہے ۔ چچا مجھے بتانے لگے ۔ ”یہاں بجلی

ی مناسب انتظام نہیں ہے ۔ صرف سرکاری ہسپتال، فوجی اڈوں اور اعلیٰ سرکار

افسروں کو ہی بجلی مل سکتی ہے۔“

کے میں نے حیرت سے کہا۔ ”اور پتلی پگڈیاں؟ وادی کے دوسرے حصے؟ اس وادی کے

“! لوگ!؟؟ ان کے چھوٹے چھوٹے گھر؟؟؟ انھیں ایک آدھ بلب ہی تو چاہیے چچا!

ب ”ان کے لئے گنجائش نہیں بیٹا۔ یہاں کا بجلی پیدا کرنے کا سلسلہ مختصر ہے اور مانگ

زیادہ ہے۔“ چچا نے سرکاری افسرانہ جواب دیا۔

ملنا ہوائی اڈے کی سڑک ختم ہوتے ہی راہ کی کٹی پھٹی سطح کے باعث جیپ نے اچھ

ور شروع کر دیا ایسے رستوں پر میرے لئے جیپ چلانا ناممکن تھا۔ بعض جھٹکے ایسے ز

دار تھے کہ ڈرائیور کو خوب جم کر بیٹھنا پڑتا ورنہ باہر گر جانے کا امکان تھا۔

ساکت اندھیری فضا میں مقامی نغموں کی ہلکی آواز اُبھری۔ نوبتوں اور سارنگیوں کی لے پر مقامی لوگ گا رہے تھے۔ عورتوں اور مردوں کی ملی جلی آوازیں تھیں۔ معلوم ہوتا تھا۔ خاصا بڑا ہجوم ہے۔ میں نے فرمائش کی۔ ''چلو چچا دیکھیں کیا ہو رہا ہے۔''

ہم ذرا فاصلے پر رک گئے۔ نیچے ڈھلوان میں خیموں کا پڑاؤ تھا۔ خیموں کے اندر اور باہر جگہ جگہ ''دینیوں'' کی روشنی سے احاطہ منور تھا۔ درمیان میں لکڑیوں کے ڈھیر کو زبردست آگ لگ رہی تھی۔ اس کے گرد گنگناتی مردوں اور عورتوں کی محفل جمی تھی۔ وہ گا اور ناچ رہے تھے۔ اور بہت خوش تھے۔ لچکتی روشنی میں کسی عورت کا بندہ کسی کے لہراتے بال، کسی کی اٹھی باہوں کے کنگن، سرخ آنچل کی جھلک، کالی ٹوپی پر لرزتے چاندی کے سکے۔ اور مسکراتے ہونٹ کچھ دیر کے لئے عیاں ہوتے اور پھر جھومتے ہوئے سائیوں کے اس دائرے میں تحلیل ہو جاتے جو الاؤ کے گرد منڈلا رہے تھے۔ ان کے جسم موسیقی کی جھنکار کے ساتھ متحرک تھے۔ پاؤں کی تھپ تھپ اور تالیاں۔ نوبتوں کی دف دف اور شہنائیوں کی آواز۔

یہ مسرور کن سماں تھا۔ مرد زیادہ تر کھانا تیار کرنے، پینے اور پلانے کے انتظام میں لگے تھے۔ عورتیں گا اور ناچ رہی تھیں۔ بعض مرد موسیقی کے آلات سنبھالنے تھے۔ بچے کھیل کود میں مگن تھے۔

''یہ سب کیا ہے چچا؟ یہ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ چلو ان کے پاس چلیں اور ممکن ہو تو ان کی دعوت میں شامل ہوں۔''

''نہیں بیٹی۔ ان کی مقامی شراب ''آب ہنزہ'' بہت تیز ہے۔ اس وقت مرد اور

عورتیں سبھی مست معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارا اور خاص کر تمہارا اس دعوت میں شریک ہونا ممکن نہیں۔"

"یہ ہو کیا رہا ہے؟"

"یہ ان کا بہت اہم مقامی تہوار ہے۔ یہ لوگ تمام رات گائیں اور ناچیں گے۔ پئیں گے اور خوشی منائیں گے۔ برسوں پہلے آج کی رات انھوں نے متحد ہو کر ایک ظالم راجہ کے ظلم سے اپنے آپ کو آزاد کیا تھا۔ ہر سال جب یہ دن آتا ہے تو اُس واقعہ کی خوشگوار یاد میں یہ تمام رات گاتے اور ناچتے ہیں۔" آپ ہنزہ سے مست ہو کر"۔

"لیکن کیا واقعہ ہے؟ مجھے بتائیں نا چچا"

چچا نے بتایا کہ گلگت ایک چھوٹی سے ریاست تھی۔ برسوں قبل اس پر راجے حکومت کرتے تھے۔ یہ راجے مصیبت، قحط، غربت، بیماری اور ان کے سدِ باب کی ذمہ داریوں سے واقف نہ تھے۔ انھوں نے اپنا رشتہ دیوتاؤں سے جوڑ رکھا تھا اور ان کے حوالے سے خوف و ہراس پھیلا کر راج کرتے تھے۔ انسانوں سے علیحدہ، دیوتاؤں کے قریب، یہ انسان نما باشندے اپنی مرضی کے مالک تھے۔ ان کی زندگیوں کا مقصد اپنی ہر خواہش کی تکمیل تھا۔ وہ جائز و ناجائز عدل و ظلم، ہمدردی و بے تعلقی، انسانیت و وحشت۔ ان میں تفریق کی سمجھ سے عاری تھے۔ راجہ ہونے کے ناتے وہ اپنے آپ کو ان قدروں سے بالاتر سمجھتے تھے۔ وادی ان کے لئے بازی گاہ تھی، اور گلگتی ان کی سہولت کا ذریعہ۔ وادی کے لوگ برسوں سے ان کے ظلم کا شکار تھے۔ وہ زندگی کے اس ڈھب کو دیوتاؤں کی رضا سمجھ کر سہنے کی عادی ہو چکے تھے۔

یہ راجہ نہایت وحشی تھا۔ اس کی وحشت نے گلگتیوں میں سخت ہراس پھیلا رکھا تھا۔ اس

کے ظلم کے ہاتھ متعدد تھے۔اس نے اپنے حواریوں کی ایک مضبوط جماعت کو جنم دیا۔یہ لوگ راجہ کے گرد رہتے۔اس کے اشاروں پر ہر ظلم کے لئے تیار ہوتے اور اس کے بچے کھچے پر عیش کرتے۔گلگتیوں ہی کی اولاد یہ نوجوان اپنی اصل سے بہت دور جا چکے تھے۔ان میں اور گلگتیوں میں ایک خلیج پیدا ہو چکی تھی۔اس نئی جماعت کی وفا نہ تو انسان سے اور نہ دیوتا سے اور نہ ہی راجہ سے بلکہ اپنی ذاتی ہوس سے منسلک تھی۔راجہ کے پاس اس ہوس کو مطمئن کرنے کے ذرائع زیادہ تھے۔لہٰذا یہ لوگ اس کے حواری تھے۔جب راجہ کا بچا کھچا سامنے آتا تو ان کی انسانیت چندھیا جاتی بغیر محنت کے کمائی ہوئی یہ سہولتیں اُن کی روح وضمیر خریدنے کے لئے کافی ہوتیں۔یہ لوگ راجہ کے ظلم پر دُم ہلاتے۔جائز وہ ناجائز کی تفریق سے یہ عاری تھے۔انسانیت و وحشت میں فرق سے منکر تھے۔

راجہ کی عادات بد بے شمار تھیں۔ان میں سب سے افضل بسیار خوری تھی وہ بہت زیادہ خوراک مزے لے لے کر کھاتا۔بہت گوشت خور تھا گلگت میں جہاں سردیاں ملی جلی خوراک کھا کر ہی بسی کی جاسکتی تھی۔اس عادت کو بہت معیوب سمجھایا جاتا تھا۔لوگ خشک پھل اور پنیر کے ٹکڑے کھا کر گذارا کرتے مگر راجہ ہر روز تازہ گوشت مانگتا اور سیروں کے حساب سے کھا جاتا۔محدود ذرائع، قلیل پیداوار۔غربت اور رسل و رسائل کے محدود و مسدود ہونے کے باعث گلگتی راجہ کے اس قسم کے بے جا مطالبات سے کافی پریشان رہنے لگے۔بھیڑ بکریوں کے بچے جاس کے مرغوب غذا تھے۔بھیڑ بکریوں کے بچے وہ حفاظت سے پالتے تھے۔یہ اُن کے مستقبل کا مسئلہ تھا۔بچے ختم ہو جائیں تو بھیڑ بکریاں گئیں۔بھیڑ بکریاں نہ رہیں تو بہت کچھ نہ رہا۔نہ گوشت نہ اون، نہ لبادے، نہ کمبل۔پھر سردیوں کی برف موت کا پیغام بھی لا سکتی تھی

۔ان جانوروں کو گلگتیوں کی زندگیوں میں خاص اہمیت حاصل تھی ۔راجہ انھیں کے بچے کھا رہا تھا۔ایک بچہ روزانہ اُس کی خوراک تھی ۔گائے کا ہو یا بھیڑ کا یا بکری کا۔

کاش جنگلی جانوروں کے بچے میسر ہو سکتے ۔راجہ کا پیٹ تو بھرتا کسی طرح راجہ کے اپنے اصطبل خالی ہونے لگے تو گلگتیوں کی باری آئی ۔ راجہ کے دندناتے حواری گھوڑوں پر وارد ہوتے ۔کس کا گلا؟ کس کی چراگاہ؟ کوئی سوال و جواب نہ ہوتا ۔ گلوں میں ہاتھ ڈالتے۔

بھیڑ بکریوں کے بچے پکڑتے ۔اور اسی طرح دندناتے محل کو روانہ ہو جاتے ۔عجیب لوٹ مچی تھی ۔ گلگتی لُٹ رہے تھے اور خاموش تھے ۔دیوتائی سلسلہ جوٹھرا۔راجہ کے رسوخ کو صرف دیوتا ہی کم کر سکتا تھا۔وہ بے چارے تو اس کے رحم و کرم پر تھے ۔اس طرح وقت گذرتا گیا اور گلگتی اس پیٹو راجہ کا راج سہتے گئے۔

سردیوں کے دن تھے ساری وادی سفید ہو رہی تھی ۔لوگوں کی چھتیں برف سے اَٹی پڑی تھیں ۔برف آسمان سے گرتی چلی آ رہی تھی خاموشی سے ۔آہستہ آہستہ ۔فضا بھاری اور خنک تھی ۔مگر ہوا کے بندے ہونے کے باعث یخ بستہ نہ تھی ۔پتھریلے گھروں کے اندر دبکے بیٹھے گلگتی برفباری کے رُکنے کے منتظر تے تاکہ چھتوں سے برف ہٹا سکیں۔

مرجان بستر پر پڑی کراہ رہی تھی ۔وہ درد سے بلبلا رہی تھی ۔بلبل خان کمرے کے کونے میں کھڑا بیوی کی تکلیف دیکھ رہا تھا۔وہ دعا کر رہا تھا کہ خیریت سے وقت کٹ جائے ۔دائی ماں مرجان پر جھکی اُس کے ماتھے کا پسینہ پونجھ رہی تھی ۔مرجان کا پھولا ہوا پیٹ کافی نیچے آ گیا تھا ۔رہ رہ کر درد اُٹھتا تو وہ بے بسی سے بلبل خان کو

دیکھتی رہ جاتی۔درد کی لہر ختم ہونے ہی وہ بے جان سی ہو جاتی۔دائی ماں کہتی ''زور لگا زور جب درد تب زور لگا بچی''۔

اُسی کمرے کے کونے میں ایک طرف جانور بندھے تھے۔بھیڑیں، بکریاں، چند بیل اور گائیں۔یہی ان کا کل اثاثہ تھا۔سردیوں میں مرجان اور بلبل خاں ان کو اوپر اسی کمرے میں لے آتے تا کہ ان کی حرارت سے خود بھی گرم ہو سکیں۔مکان کی دیواریں پتھروں اور مٹی سے بنائی گئی تھیں چھت کو لکڑی کے شہتیروں سے چن کر چیل کی تر ڈال کر اور مٹی سے لیپ کر بنایا گیا تھا۔لکڑی کے کواڑ اور کھڑکیاں بلبل خاں نے خود اپنے ہاتھوں سے کاٹ چھانٹ کر بنائی تھیں۔فرش کچا تھا۔مرجان اسے گرمیوں میں اکثر لیپا کرتی، کرمے کے ایک کونے میں ذرا اونچے تھڑے پر پٹوؤں کی تہہ جمی تھی۔نیچے بھی پٹو اور اوپر رکھنے کے لئے بھی پٹو۔ان پٹوؤں کو مرجان نے گذشتہ سردیوں میں اپنی ہی بھیڑ بکریوں سے اون لے کر بنا تھا۔محنت سے، نفاست سے۔آج وہ انہی پر لیٹی، اپنے بچے کی آمد کی تکلیف میں مبتلا تھی۔

کمرے کے درمیان ایک ستون تھا اس کے ساتھ مختلف مشکیزے ٹنگے تھے۔بکریوں کی کھالوں کے بنے ہوئے۔ایک میں خشک پنیر، ایک میں گھی، ایک میں خشک بادام، انگور، اخروٹ، شہتوت اور میوہ۔ایک بڑے مشکیزے میں دیگر خشک پھل۔ساتھ ہی زمین پر ایک اور مشکیزہ رکھا تھا۔اس میں سوکھے سیب کو پیس کر نکالا گیا آٹا تھا۔دو اور بڑے مشکیزے تھے جن میں موٹی موٹی پھلیوں سے نکالے گئے موٹے مٹروں کی شکل کے سوکھے دانوں کا آٹا رکھا تھا۔یہ تھا ان کا موسم سرما کی خوراک کا ذخیرہ۔وادی میں ابھی گندم اور مکئی کے بیجوں سے لوگ ناواقف تھے۔مٹروں سے ملتی جلتی پھلیوں کے پودے اُگائے جاتے۔ان کے پک جانے پر دانوں کو سُکھا کر

آٹا حاصل کرلیا جاتا۔ ذائقہ میں یہ گندم اور مکئی سے کمتر ہوتا۔

(بلتستان کے دور دراز علاقوں میں ابھی تک اس پودے کی کاشت ہوتی ہے اور اسے غذا کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ۱۹۶۳ء میں رٹو گئی۔ وہاں اس پودے کے کھیت دیکھ کر مجھے بہت تعجب ہوا۔ اُس وقت وہاں لوگوں کو مکئی کے بیج دیئے جا چکے تھے اور وہ اُس کے ذائقے سے روشناس تھے۔ مگر اس پرانی فصل کو بھی ساتھ ساتھ کاشت کر رہے تھے۔)

چھت کے قریب چھتیاں نصب تھیں۔ ان پر مٹی اور پتھروں کے برتن، کھالوں کے ٹکڑے۔ جانوروں کی سوکھی آنتوں کے ڈوروں کے گولے حفاظت سے رکھے تھے۔ بند کھڑکی کے ساتھ کھٹولی نصب تھی۔ اس پر ادھ بنا پٹو پڑا تھا۔ کمرے کے ایک طرف آتش دان تھا۔ اس میں لکڑیاں سلگ رہی تھیں۔ کمرے کے دور کونے میں بھی لکڑیوں کو ڈھیر تھا۔ دیگر جانوروں سے پرے ایک طرف ایک بکری بندھی تھی۔ یہ بھی بچے سے تھی اور مرجان کی طرح درد میں مبتلا تھی۔ جب وہ اگلی ٹانگوں کو زور سے زمین پر مار کر سر نیچا کرتی تو بلبل خاں جلدی سے اس کے پاس پہنچ جاتا۔

بکری نے منا سا میمنا پیدا کیا۔ سفید معصوم ''بے بے بے''

یہ ننھی سی آواز سن کر مرجان اس درد میں بھی مسکرا اٹھی۔ اُس نے دیکھا بکری تھک کر نڈھال بیٹھی ہوئی تھی۔ بچہ ایک طرف اپنی ناتواں ٹانگوں پر کھڑا تھا۔ مگر کچھ دیر بعد دھپ سے بیٹھ گیا۔ بلبل خاں نے کچھ دیر بعد بکری کو گرم پانی دیا۔

''ہائے''۔ مرجان چیخی۔ بچہ بہت نیچے آچکا تھا۔ پیٹ کے آخری کونوں میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔ مرجان نے بہت کوشش کی۔ دائی ماں نے زور سے پیٹ دبایا پھر جیسے بند

p0026.gif p0027.gif p0028.gif p0029.gif

نالیاں پرآب تھیں ۔ دریا گرم دھوپ کے مزے لے رہا تھا ۔اور پر جوش رواں تھا ۔ کھیتوں کے درمیان جگہ بہ جگہ بڑی بڑ چپٹی چٹانوں پر خوبانی، شہتوت، سیب اور انگور سکھائے جارہے تھے ۔انگوروں کی سبز بیلوں پر جھکی عورتیں خوشے چن رہی تھیں ۔ دور سے سبزے کے درمیان بکھرے ہوئے ان کے لال لال چولے بہت خوشنما دکھائی دیتے ۔مگر اب ان کے بچے جو کڑیاں بھرتے اِدھر اُدھر نہ دوڑتے ۔ وہ جمگھٹا بنائے اپنے ماؤں کے ساتھ رہتے ۔ وہ معصوم بچوں کو ''گندک'' کیئے پشت سے باندھے رکھتیں ۔ اب انھیں درختوں کے سائے میں کھلا چھوڑنا محفوظ نہ تھا ۔شام ہوتے ہی یہ عورتیں اپنے بچوں کے جھرمٹ ساتھ لگائے، پھلوں کو ٹوکریاں اُٹھائے گھروں کو روانہ ہو جاتیں ۔ان کے مرد لکڑیاں اور گھاس کے گھٹے اٹھائے گھروں کو روانہ ہو جاتیں ۔ان کے مرد لکڑیاں اور گھاس کے گھٹے اٹھائے ۔جانوروں کے ریوڑ ہانکتے واپس آجاتے ۔یہ لوگ کھانے اور سونے کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتے ۔ ابھی شفق کی سرخی ماند نہ ہوئی ہوتی کہ وادی پر سناٹا چھا جاتا ۔

مرجان اپنے بچے کو سلا رہی تھی ۔معصوم بچہ چاند کو دیکھ رہا تھا ۔اُس کے اُٹھے ہوئے ہاتھ، ادھ کھلی آنکھیں، وا ہونٹوں سے جھانکتی دانتوں کی سفید لڑی ۔کلکاریاں ماتی ہنسی کی آواز، مراجن کے دل میں خوشی اور سکون کی لہریں جگا رہی تھی، بلبل خاں مر گیا ۔لیکن شکر ہے اپنی نشانی چھوڑ گیا ۔اُس نے اپنے بیٹے کا نام بھی بلبل خان رکھا تھا ۔اُسے اب بھی وہ وقت یاد تھا تند و تیز طوفان میں جب مرجان کو درد اٹھا تو بلبل خاں سے نہ رہا گیا ۔بلبل خاں کو اُس کی جان کی فکر رہتی ۔

''میں ٹھیک ہوں ۔اپنے آپ کو سنبھال لوں گی ۔باہر سخت جھکڑ چل رہا ہے ۔تو نہ جا

بلبل خاناں''۔

بلبل خاں کو بکری کا یوں چیکے سے مر جانا یاد تھا۔ اُس نے مرجان کی نہ سنی ۔وہ چلا گیا مگر ایسا گیا کہ پھر نہ لوٹا ۔مرجان نے بچہ خود پیدا کیا ۔خود ہی سنبھالا ۔اور ساری رات اُسے سینے سے لگائے راہ دیکھتی رہی ۔

صبح ہوئی ۔گاؤں والے آئے دوست عزیز آئے تو ساتھ ہی بلبل خاں کی لاش آئی ۔ وہ طوفان میں درخت کے نیچے آ کر کچلا گیا تھا۔ اُسے دفنا دیا گیا تھا۔ پھر ہفتوں گذر گئے ۔وہ ادھ موئی سی ہوگئی تھی ۔دوست عزیز اُسے سنبھالتے ۔اس کے بچے کو، اس کے گھر بار کو دیکھتے ۔فصلوں، جانوروں کا خیال رکھتے ۔مرجان بہت آہستہ آہستہ زندوں میں واپس آئی ۔اب چھوٹا بلبل خاں ہی اُس کی زندگی کی دوڑ تھا۔

چھوٹا بلبل خاں اب تین سال کا ہو چکا تھا۔ مرجان سارے کھیتوں کا کام خود کرتی ۔ مویشیوں کی حفاظت کرتی ۔لکڑی اسے پڑوسی کاٹ کر لا دیتے ۔بیوہ ہو کر بھی اُس نے اپنا گھر، اپنی زمین نہ چھوڑی ۔دوسری شادی کا کبھی نہ سوچا ۔اپنے بچے کو دن رات سینے سے لگا کر رکھا۔

سارا سارا دن وہ گندھک کئے بچے کو پشت سے باندھے کام کرتی رہتی ۔چھوٹا بلبل خاں نہ ہوتا تو وہ کبھی کی مر چکی ہوتی ۔گلگتی یہ بات جانتے تھے ۔اس کے احساسات کا احترام کرتے تھے ۔کسی نے اُس سے شادی کی بات نہ کی تھی ۔

''کھڑکی کھلی رکھنا ماں''۔

''میں صدقے بیٹا'' ۔مرجان نے بچے کو سینے سے چپکایا اور سوچا ۔''یہ سو جائے تو اُٹھ کر بند کر دوں گی''۔

ایک دوسرے کے سینے سے لگے وہ اور اس کا بیٹا دونوں سے گئے۔

سورج کی کرنیں مرجان کی پلکوں سے کھیل رہی تھی۔اُس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔اُس کا ذہن بالکل خالی تھا۔پھر سامنے آسمان نظر آیا-----روشن چمکدار دھوپ نکل ہوئی تھی۔سبز کھیتوں کی مہک فضا میں تھی۔درختوں کی شاداب ٹہنیاں ہل رہی تھیں۔"تھپ تھپا تھپ" کھڑکی کے قریب ہی چند سیب گرے۔مرجان نے پلکیں جھپکائیں۔جسم میں انتہائی سُستی محسوس کی۔پھر یکدم اُٹھ بیٹھی۔سامنے کھڑکی کھلی تھی----اور پھر اس کا پہلو خالی تھا۔چھوٹے بلبل خاں کو ٹوپی سرہانے گری پڑی تھی اور بلبل خاں----

مرجان کے منہ سے بھیانک چیخ نکلی۔

"یہ کیسا "بگا" اور مرجان"؟؟؟

گلگتی مرد،عورتیں،جوان بچے سبھی مرجان کے گھر کو لپکے۔

مرجان کے کلیجے میں درد اٹھا۔کوئی اُس کی روح کو مسل رہا تھا"میرے چھوٹے بلبل خاناں----"مرجان نے آخری آہ بھری۔

جب لوگ مرجان کے گھر پہنچے تو وہ دروازے سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔اُس کا رنگ زرد تھا۔آنکھیں پتھرا چکی تھی۔عورتیں نے اسے پکڑنا چاہا تو وہ ایک طرف لڑھک گئی۔وہ مردہ تھی۔

گلگتیوں کے چہروں پر عزم تھا۔اُن کی گردنیں تنی تھیں۔جسم ارادے کی لہریں اور بے خوفی کی جھلک تھی اب بہت کچھ ہو چکا تھا۔اب وہ مزید کچھ برداشت کرنے کو

تیار نہ تھا۔اب وہ مجرم کی پہنچان چاہتے تھے ۔وہ بہت سامعصوم خون دے چکے تھے ۔اب انتقام کا وقت آچکا تھا۔اسی ارادے سے وہ عبادت گاہ میں جمع ہوئے ۔مرد، عورتیں، بچے، جوان سبھی ۔ان میں سے سات گلگتیوں نے محل کے پچھواڑے گہری کھڈ تھی جو دور نشیب میں جا کر ختم ہوئی ۔ یہاں پھر دوسرے اونچے پہاڑ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ۔ یہ جگہ کڑوے باداموں کے درختوں سے اٹی پڑی تھی ۔ جب راجہ کا بہت سارا کھانا پکتا تو ہڈیاں گوشت کے بچے کھچے ٹکڑے اور باقی ماندہ سارا گند کھڑکی سے یہاں پھینک دیا جاتا۔کڑوے باداموں پر گدھ ۔چیل اور کوے سارا دن بیٹھے رہتے ۔

یہ عجیب منحوس جگہ تھی ۔دن کا بھی شام کا گمان رہتا۔تنگ نالی جیسی وادی میں راستہ دشوار گذار تھا۔ یہ جگہ آسیب زدہ سمجھی جاتی تھی ۔اور آسیب راجہ کی محل کے پچھواڑے کی حفاظت کرتے تھے ۔سات بوڑھے اس جگہ آ کر رُکے ۔اب وہ اس گند میں کچھ ڈھونڈ رہے تھے ۔انھوں نے ایک ایک چیز کو دیکھا۔ان کی نظریں ڈھلوان کی طرف اٹھیں ۔وہ راستہ میں اُگی جھاڑیوں اور گرے پتھروں کا جائزہ لے رہے تھے۔وہ کسی ثبوت کے متلاشی تھے ۔اتنے میں تندور کے ساتھ والی کھڑکی کھلی ۔سرخ رنگ کا اونی لبادہ، چھوٹا سا، معصوم، ہلکی ہوا کے گدیلے پر جھومتا جھامتا آہستہ نیچے آیا اور آرام سے گلگتیوں کے پاؤں میں گر پڑا۔اُس کے کونوں پر ریشم کے سچے دھاگے سے نفیس بیل کڑھی تھی ۔بٹنوں کی جگہ بلبل خاں کی نشانی ---چاندی کے دو قدیم سکے لرز رہے تھے ۔

مرجان کے بچے کا خون اُن کے قدموں میں آ گرا۔درندہ اوپر محل میں محفوظ بیٹھا اُس کے مزے لے رہا تھا۔بات پکی تھی ۔شک سچا نکلا۔اُن کی مٹھیاں بھنچ گئیں بھنویں

تن گئیں، چہرے سرخ ہو گئے ۔ اب بدلہ لینا تھا ۔ ساتوں بوڑھے گلگتی سوچ میں گم واپس ہوئے ۔

بدمست راجہ انھیں گھور رہا تھا ۔ ساتھ بوڑھے گلگتی اُس کے سامنے دست بستہ کھڑے تھے ۔ اُن کے سر جھکے ہوئے تھے ۔ اور وہ سراپا التجا بنے اپنے دعوت نامے کی قبولیت کے منتظر تھے ۔

''اچھا تو تم نے میرے لئے بکری کے بچے جمع کر رکھے ہیں خاص دودھ پلا پلا کر؟ تم مجھے دعوت پر بلانا چاہتے ہو؟ مجھے خوش کرنا چاہتے، ہو؟ میری رضا سے دیوتا خوش ہو گا اور تمہارے بچے غائب ہونا بند ہو جائیں گے ۔ خوب ۔ اچھا خیال ہے ۔ کیوں؟ ''

اُس نے معنی خیز نظروں سے اپنے حواریوں کو دیکھا ۔

''ہم آ جائیں گے ۔ بلکہ بار بار آئیں گے ۔ ایسی دعوتیں ہمیں ضرور پسند آئیں گی'' ۔

''کل شام کو دریائے گلگت کے کنارے سب انتظام آپ کی خوشنودی کے لئے تیا ہو گا محترم'' ۔

''گلگتیوں نے باری باری راجہ کے ہاتھ چومے اور چلائے'' ۔

شفق کی سرخی دریا میں منعکس تھی ۔ وادی پر شام کے دھند لکے چھا رہے تھے ۔ کھیت خاموش تھے ۔ پگڈنڈیاں سونی اور درخت سرنگوں ۔ فطرت متفکر تھی ۔ سوچ میں ڈوبی تھی ۔ آج گلگتیوں کو ایک اہم قدم اُٹھانا تھا ۔ وہ اس کی تیاریوں میں لگے تھے ۔ آہستہ آہستہ بہتے دریا کے کنارے خیموں کا ایک وسیع پڑاؤ نصب تھا ۔ سب گلگتی مرد،

عورتیں، بچے جوان، بوڑھے مصروف کار تھے۔ مرد احاطہ میں ایک بڑے الاؤ کے لئے لکڑیاں چن رہے تھے۔ کچھ جگہ بہ جگہ لمبی لمبی سوٹیوں کو زمین میں گاڑ رہے تھے۔ ان کے ساتھ ''دینیوں'' کے گچھے باندھ کر مشعلیں چکے تھے۔ اُن بھونے کے لئے بیس تندور دہک رہے تھے۔ الاؤ کے چوڑے پتھروں کی بری بڑی سلیں سلیقے رکھی تھیں۔ ان پر چھریاں اور پینے کے لئے پتھر، مٹی اور لکڑی کے پیالے سجائے جا چکے تھے۔ سلوں کے بیچوں بیچ دس ستون نصب تھے۔ ان پر شراب ہنزہ کے بڑے مشکیزے اس طرح ٹنگے تھے کہ ان کا منہ کھول کر شراب بآسانی پیالوں میں انڈیلی جاسکتی تھی، دس چاق و چوبند نوجوانوں کو مقرر کیا گیا تھا کہ وہ راجہ اور اُس کے حواریوں کے پیالے خالی نہ ہونے دیں۔

انگوروں کی اس خاص شراب کو بہت اہتمام سے تیار کیا گیا تھا۔ یہ تقریباً دس سال پرانی تھی۔ اس کا اثر دس گنا زیادہ تھا۔ مختلف گھروں میں اس کا ایک آدھ چھوٹا مشکیزہ محفوظ پڑا ہوتا۔ عموماً یہ انتہائی درد یا ہڈی ٹوٹ جانے کی حالت میں یا سخت بیماری یا تکلیف سے وقتی نجات حاصل کرنے کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔ گلگتی اس شراب کو عام طور پر کبھی نہ پیتے۔ اسے بہت قیمتی سمجھا جاتا اور حفاظت سے رکھا جاتا۔ اسے کبھی کبھار ہی استعمال کیا جاتا۔ آج یہ پُر اثر شراب مشکیزوں میں بندراجہ کی نذر ہو رہی تھی۔ اس میں الائچی اور خالص شہد ملایا گیا تھا تا کہ پر مزہ ہو سکے۔

گلگتیوں نے اپنا سب اثاثہ اس آخری داؤں پر لگا دیا تھا۔ اس کا کامیاب ہونا اُن کے لئے ازحد ضروری تھا۔ وہ سب جانتے تھے کہ ناکامی کی صورت میں اُن کی زندگیاں موت کی خواہش میں گذریں گی۔ اُن کے پُر استقلال چہروں پر تذبذب قطعی نہ تھا۔

راجہ کے لئے تخت سجایا گیا۔عورتوں نے اسے جنگلی پھولوں سے بھر دیا۔جنگلی پھولوں کے ہار تیار کئے گئے۔انھیں گردونواح کے درختوں اور جھاڑیوں پر ٹانگا گیا۔شام گہری ہوتے ہی دینیوں اور الاؤ کی رشنی سے احاطہ منور ہوگیا۔گانے بجانے کی آوازیں فضا میں بھرنے لگیں۔جونہی راجہ کی ٹولی قریب پہنچتی ستائش اور خوش آمدید کے نغمے بلند ہوئے۔عورتوں نے رقص شروع کردیا۔کنگنوں کی چھنکار اور نوبتوں کی ''دف دف'' اُٹھی۔باہیں مچلیں۔آنچل لہرائے۔متحرک پاؤں کے ساتھ جسم جھومے۔میمنے،شراب،چہل پہل،پھول،ہنگامہ،خوشی،گیت اور رقص دیکھ کر راجہ خوش ہوگیا۔اُس نے شراب طلب کی۔دو گھونٹ بھرے۔اس کی لذت سے محفوظ ہوا۔اُس کے قہقہہ لگایا۔اپنے حواریوں کو بھی شراب نوشی کی اجازت اور تخت پر جا بیٹھا۔

گھنٹوں رقص ہوتا رہا۔شراب کے جام چلتے رہے۔راجہ میٹھی شراب سے اتنا لطف اندوز ہورہا تھا کہ اُس نے ابھی تک گوشت طلب نہ کیا تھا۔اس کے حواری بھی بدمست جام پر جام پئے جارہے تھے۔

آدھی رات گذر چکی تھی۔راجہ کے حواری بے ہوش پڑے تھے۔راجہ کے ہاتھوں میں سکت نہ تھی۔مگر مست آنکھوں میں شراب کی طلب ابھی باقی تھی۔ایک گلگتی نے پیالہ اُس کے منہ سے لگایا۔راجہ نے بمشکل پیا اور بے دم گر پڑا۔

اب الاؤ کی آگ ماندتھی۔دینیوں کی روشنی بجھ چکی تھی۔۔احاطہ میں اندھیرا تھا۔اندھیری رات میں پڑاؤ گم تھا۔دور سے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔محض گانے بجانے کی آوازوں،شور اور ہنگامہ اور قہقہوں سے پُرمسرت دعوت کا احساس عیاں تھا۔یہ ہنگامہ،یہ قہقہے،یہ موسیقی جاری رہی۔عورتیں بدستور ناچتی رہیں۔شراب کے مشکیزوں سے ہٹ کر دس گلگتی آگے آئے۔اُنھوں نے سلوں کو خالی کیا۔راجہ اور

اُس کے حورایوں کو اٹھایا۔انھیں سلوں پر باندھا اور اُٹھا کر باری باری دریا میں پھینک دیا۔سب سے پہلے راجہ گرا۔

''شڑ اپ'' دریا میں کچھ ساعت کے لئے سوراخ ہوا،پھر پانی برابر وہ گیا۔

شڑ اپ!شڑ اپ !شڑ اپ !

شڑ اپ!شڑ اپ !شڑ اپ !

تخت خالی تھا۔سلیں جا چکی تھیں ۔دریا خاموش موجزن تھا۔درندے ڈبو دئے گئے تھے۔بچے محفوظ تھے۔اور گلگتی سلامت۔

گلگتیوں کی خوشی کی انتہا نہ تھی ۔اب شراب کے مشکیزے انھوں نے اپنی طرف موڑے،ایک دوسرے کو جام پیش کئے ۔دینیاں بھڑ کائیں ۔الاؤ تیز کیا اور کامیابی اورمسرت کی کیفیت سے سرشار رقص کیا۔وہ تمام رات پیتے رہے اور ناچتے رہے۔ فضا اُن کے نغموں سے چھلکتی رہی۔گلگتی بہت خوش تھے ۔بہت مدت کے بعد خوش۔ آج انھوں نے ایک بہت بڑا کام کیا تھا۔اپنی محدود زندگیوں میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا تھا۔انھوں نے اپنی نسلوں کو اب درندوں سے نپٹنا سکھا دیا تھا۔اب ظلم کی انتہا نہ ہوسکتی تھی۔مظلوموں کو اپنا دفاع آ گیا تھا۔

دوسری صبح سورج کی پہلی کرن نے گلگتیوں کے محفوظ اور مطمئن چہرے دیکھے ۔وہ خیمے باندھ رہے تھے ۔،پڑاؤ سمیٹ رہے تھے ۔ان کے بچے چوکڑیاں بھرتے اِدھر سہ اُدھر دوڑ رہے تھے،اور مائیں بے فکر کاموں میں مگن تھیں ۔

میں اور چچا دیر تک خاموش رہے ۔ایک عجب تاثر نے ہمارے ذہنوں کو اپنی گرفت

میں لے لیا تھا۔

"کیا راجہ کے خاندان کو راجہ کے یوں غائب ہو جانے سے تشویش نہ ہوئی ؟ کیا انھوں نے کچھ نہ کیا؟؟" میں نے پوچھا۔

اور چچا بولے "کہا جاتا ہے کہ وہ بہت مدت تک خوفزدہ رہے۔ دراصل انہوں نے سمجھا۔راجہ بھی دیوتائی قہر کا شکار ہو گیا ہے---انھوں نے گلگتیوں پر کوئی شبہ نہ کیا۔ آخر صدیوں کی ایک کمزور، روندی ہوئی، بے زبان مخلوق پر وہ کیسے شُبہ کرتے!"

رڑا گاسس

سورج دھیرے دھیرے نانگاپربت کی چوٹی تک پہنچا ہے تو وادی پرپھیلی پھیکی دھوپ میں ٹھنڈک بڑھ گئی۔ درختوں کے سائے کچھ اور لمبے ہوگئے ہیں۔ ''جلی پور'' کے سب کھیت خالی ہیں۔ ان میں جا بجا پیوست گھروں کے اندر، ادھ کھلے کواڑوں سے آتی جاتی، رنگین لبادوں میں ملبوس عورتیں مصروف کار ہیں۔ تندور دہک رہے ہیں۔ ہر گھر میں کھانے اور سونے کی تیاریوں کا ہنگامہ ہے۔ مرد بیٹھے ہیں۔ بچے منتظر ہیں۔ اور مائیں، بہنیں، بیٹیاں، کھانے، پکانے اور برتن، بستر سنوارنے میں لگی ہیں۔

یہ بہت ہی خوبصورت جگہ ہے۔ نانگاپربت کے آگے ۱۹ ہزار فٹ بلند رڑا گاسس ایک چھوٹا پہاڑ پہاڑ ہے۔ اس کے دامن میں دو گاؤں ہیں ''جلی پور'' اور ''رائے کوٹ'' راڑا گاسس کی چوٹی، ان دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹے، اپنی پشت نانگا پربت کی طرف کیے، ایک ماں کی طرح تنی کھڑی ہے، یوں جیسے وہ نانگاپربت کے برفانی طوفانوں سے اُنھیں بچانا چاہتی ہو۔ اس کے دامن میں ''تتو پانی پانی'' کا گرم چشمہ ہے جو دونوں گاؤں کی مشترکہ دولت ہے۔ رائے کوٹ سے انڈس گذرتا ہے جس پر حال ہی میں چینیوں نے ایک پُل تعمیر کیا ہے۔

''جلی پور'' رڑا گاسس کا بہت احترام کرتے ہیں۔ مقامی باشندے چوٹی کو کبھی سر نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ چوٹی پاک ہے۔ اس پر قدم رکھ کر اسے ناپاک کیا جائے تو یہ ضرور بدلہ لیتی ہے۔

رڑا گاسس پر دو پتھر پیوست ہیں۔ اگر انہیں بہت دور سے دیکھا جائے تو یوں لگتا ہے

جیسے یہ دو مجسمے ہیں ۔ایک عورت کا اور دوسرا مرد کا ہر روز جب سورج، وادی پر سے آہستہ آہستہ گزرتا چوٹی تک پہنچتا ہے اور جب اس کی کرنیں ان دو مجسموں کو اُجاگر کرتی ہیں تو وہ یوں یکلخت ڈوب جاتا ہے۔ جیسے شرما کر چھپ گیا ہو۔تب وادی پر ایک دم اندھیرا چھا جاتا ہے۔

انہی پتھروں سے وابستہ یہ ایک عجیب داستان ہے۔

جلّی پور پر سناٹا تھا۔ ہلکے اندھیرے میں لپٹی فضا چپ تھی ۔ پہاڑوں، درختوں اور چٹانوں کے ہیولے افسردگی میں ڈوبے تھے۔فطرت ماتم کناں تھی۔جلّی پوری غمزدہ ۔راجہ کے گھر کے احاطہ میں جابجا الاؤ جل رہے تھے۔تڑپتے شعلوں پر جھکے لوگ خاموش اور بے بس تھے۔گھر کے بند کواڑ رہ رہ کر کھلتے کوئی باہر آتا،کوئی اندر جاتا تو فضا تھوڑی دیر کے لئے سسکیوں اور آہوں سے گونج اُٹھتی ۔

رانی مر چکی تھی ۔ابھی ابھی ۔کچھ دیر پہلے ۔دو جڑواں بچوں کو جنم دے کر۔رانی نیک دل،انسانیت دوست اور ہمدرد خاتون تھی۔جلّی پوریوں کو اس کی ذات کا بڑا سہارا تھا ۔راجہ اس کی بہت قدر کرتا تھا ۔وہ اکثر لوگوں کے آڑے آتی اور ان کی سزائیں معاف کروادیتی۔

آخر یہ کیا دیوتائی مصلحت تھی کہ رانی گئی اور دو بچے آ گئے؟؟۔

یہ کوئی مصلحت تھی یا نحوست اور قہر کی علامت؟؟۔

جلّی پوری غمزدہ بھی تھے اور خائف بھی ۔ بچے ساری رات نرم پٹوؤں میں لپٹے، شہتوت کی تازہ اور چھلی ہوئی ٹہنیوں سے بنی ٹوکری میں پڑے رہے۔کسی نے انہیں ہاتھ نہ لگایا۔عورتیں رانی کی میت کے گرد بیٹھی روتی رہیں ۔

صبح ہوئی تو گھر کے چار طرف وادی میں کاروبارِ زندگی شروع ہوا۔ اندر رانی کی میت کے گرد ماتم کر کر کے رات بھر کی تھی ہوئی عورتیں سو رہیں تھیں۔ کوئی کہیں اور کوئی کہیں۔

''اُوآں اُوں آں اُوں آں'' بچے بلک بلک کر رونے لگے۔ تھی ماندی عورتوں نے سر اٹھانے۔ دو دائیاں آگے بڑھیں۔ انہوں نے بچے اُٹھائے انہیں صاف کیا اور سینے سے لگا لیا۔ ان کے ننھے منے کھلے۔ وہ دودھ پینے کی کوشش کرنے لگے۔

''اوئی'' ایک دائی نے سسکی لی۔ ''پہلے ہی دن جب بچوں کو دودھ چوسنا بھی مشکل سے آتا ہے، یہ بچہ میرا سینہ کھا رہا ہے۔ پہلے ماں کو کھا گیا، اب مجھے کھائے گا۔'' دائی نے جھرجھری لی اور بچے کو جلدی سے ٹوکری میں ڈال دیا دوسری بچی نے اپنے ننھے منے مٹھی بند ہاتھ اپنی دائی کے سینے سے لگائے نرم منہ دو چار بار مارا۔ پھر سو گئی۔ اس کے معصوم رخساروں کا لمس دائی کے سینے میں ٹھنڈک پہنچا رہا تھا۔ دائی کا دل ممتا سے بھر آیا۔ اس نے بچی کو ٹوکری میں واپس نہ ڈالا۔ سارا دن اسے سینے سے لگائے رکھا

۔

دیوتا نے دو بچے عطا کیے تھے۔۔۔ مگر مجسم تضاد۔

ایک لڑکا۔۔۔۔۔ دوسرا لڑکی

لڑکا۔۔۔ بدصورت، بداخلاق، بدکردار، کمزور شخصیت، محدود عقل، بزدل حوصلہ اور بے حد مقبول، بدقسمتی اور دیوتا کی مرضی کہ وہ راجہ نہ ہو سکتی تھی ورنہ جلّی پوریوں کو رانی کا غم بھول جاتا۔

رانی کی موت کے بعد راجہ بھی زیادہ دیر زندہ نہ رہا۔ اس نے شراب کا استعمال

کثرت شروع کر دیا۔ اکثر گھوڑا لئے بد مست حالت میں اکیلا ہی شکار کو نکل جاتا۔ ایک دن ایسا گیا کہ پھر نہ لوٹا۔ سارے دن کی تلاش کے بعد ایک کھوہ میں گرا مردہ پایا گیا۔ گھوڑے کی ٹانگ ٹوٹ چکی تھی۔ اسے اذیت سے بچانے کے لئے اس کا سر کلہاڑے سے کاٹنا پڑا۔۔۔۔۔ ''جلّی پوری'' خوفزدہ تھے۔

دو بچے آئے، اکٹھے۔۔۔ انہونی بات!

رانی گئی۔۔۔ راجہ حادثہ کی موت مرا۔۔۔ اب اور کیا ہوگا؟

وہ بچوں کو پروان چڑھتا دیکھتے رہے۔

راجہ جوان ہوا تو ''جلّی پوریوں'' کو احساس ہوا کہ دیوتائی قہر تو اب شروع ہوا ہے۔ اسے سے پہلے کو جو کچھ تھا محض اس کی نشاندہی تھا۔

ظلم کی کوئی انتہا نہ تھی۔

سفاکی۔ کچھ نہ پوچھو۔

بدصورتی مبالغے کی حدوں سے بھی آگے تھی۔

چہرہ عقل کی غیر موجودگی کا اشتہار تھا۔ اور یہ راجہ دیوتائی حکم سے راج کر رہا تھا اور کسی کو جرأت نہ تھی کہ اس کے راج سے اپنی جان چھڑائے۔ جلّی پورا اور اس کے محدود ذرائع سب راجہ کی ذاتی ملکیت تھے۔ اس کے جو بھی جی میں آتا کر گذرتا۔ اس کا محبوب مشغلہ تھا ''عورت'' جلّی پور کی کسی عورت کی زندگی اور عزت اس سے محفوظ نہ تھی۔ لوگ اپنی بہنیں، اپنی مائیں، اپنی بیٹیاں، اپنی بیویاں چھپا چھپا کر رکھتے۔ پھر بھی ظالم وار کر جاتا۔ اور ذلت اور دکھ کے داغ دے جاتا۔ وہ جب بھی، جس وقت

بھی کسی عورت کو دیکھتا آپے سے باہر ہو جاتا، اور پھر گھر والوں کو اس مظلوم کی لاش ہی ملتی۔

شام کے دھند لکے پھیل رہے تھے۔کھیت سنسان تھے۔تاجور تھکی ہاری گھڑا اٹھائے واپس آرہی تھی۔اس نے سوچا۔"محبوب جان کو گئے جیسے مدت گذر گئی ہو۔ "چیلاس" کونسا دور ہے۔مگر سردیوں کی برفباری ابھی ختم ہوئی ہے۔راستے صاف ہو رہے ہیں۔وہ آتا ہی ہوگا۔انہیں دنوں"

تاجور مسکرائی گھڑے کو سر سے اُتار کر کمر سے ٹکایا اور کانوں میں آویزاں چاندی کے بالوں کو چھوا۔

"---کتنی محنت کی تھی محبوب خان نے مجھے یہ بالے خرید کر دینے کے لئے کتنے سال لگے تھے اسے رقم جوڑتے۔"تاجور کے رخسار دھک اُٹھے-----"محبوب جاناں!"

وہ سوچتی، مسکراتی، اپنی دنیا میں کھوئی، آہستہ آہستہ گھر کو آرہی تھی، گھر جو قریب تھا اور جس میں ساس تھی، اور سسر تھا اور دو ننھے بچے تھے۔

تب جھاڑی ہلی۔کسی نے جست لگائی اور تاجور کو کمرے سے پکڑ کر جھٹکا۔سفاک ہاتھ اسے پتھروں پر سے گھسیٹتا ہوا اوٹ کے پیچھے لے گیا۔تاجور کا گھڑا "چھن" سے گرا اور "چھناکے" سے ٹوٹ گیا۔جب اندھیرا پڑنے پر بھی تاجور نہ لوٹی تو دئیوں کی روشنی میں سارا گاؤں اسے ڈھونڈنے نکلا۔وہ سب چشمے تک آئے۔پھر پلٹے۔جھاڑیوں کی اوٹ میں ٹوٹا ہوا گھڑا اور روندی ہوئی گھاس اور مسلی ہوئی چادر اور پھر اَٹ کے نیچے تاجور کی لاش ملی۔

یہ آٹھویں لاش تھی نوجوان عورت کی۔جلی پور میں ہراس پھیل گیا۔سب جانتے تھے کہ مجرم کون ہے مگر کیا راجائی اور دیوتائی دبدبہ تھا کہ کسی کو راجہ سے بدلہ لینے کی نہ سوجھی! کیا کمال تھا اس صدیوں پرانی ریت میں کہ ظلم پر ظلم کئے جاؤ مگر سزا سے بے پرواہو! جلی پوری سہمے ہوئے تھے۔وہ اپنی عورتوں کے چہرے دیکھتے تو ان کے دل مسلے جاتے۔کون جانے ان میں سے کب کس کی باری آجائے۔

شام کو محبوب جان کے گھر سے اکٹھے ہوئے۔تاجور کی لاش دفنا کر سب نے ایک ہی فیصلہ کیا کہ عورتوں کو یہاں سے چلے جانا چاہیے۔وہ اس وقت تک واپس نہ آئیں۔ جب تک دیوتا راجہ کو ہم پر سے اٹھانہ لے۔

اسی رات جب راجہ تاجور کی زندگی سے کھیل کر اپنے گھر غفلت کی نیند سو رہا تھا۔ عورتوں کم سن بچوں کا ایک قفالہ جلی پور سے روانہ ہوا۔وہ رائے کوٹ سے ہوتا ہوا دریائے انڈس پر گھاس اور ٹہنیوں کی چوڑی رسی سے بنے ہوئے بڑے پل کو عبور کر کے دور اگلی بستی میں چلا گیا۔وہاں کے باشندوں نے انہیں خوش آمدید کہا۔ حفاظت سے رکھنے کا وعدہ کیا۔سب کے حالات ایک جیسے تھے۔کسی پر بھی یہ وقت آسکتا تھا۔پڑوسی باشندوں نے اس مصیبت میں جلی پوریوں کا بہت ساتھ دیا۔

جلّی پور میں اب کوئی عورت، کوئی بچہ نہ رہا۔وادی میں مرد ہی مرد نظر آتے۔مرد جانوروں کو چارہ ڈالتے۔کھیتوں کی دیکھ بھال کرتے۔لکڑیاں کاٹ کر لاتے اور اپنے کم سن لڑکوں کو خانہ داری سکھاتے۔"دیوتا! جانے کتنے برسوں کا یہ عذاب ہے۔ جو انہیں سہنا پڑے گا۔" وہ اکثر سوچتے۔

وادی سونی ہوگئی تھی۔گھر ویران تھے۔کسی آنگن میں چوڑیاں نہ کھنکتیں معصوم بچوں کا

چھکار سنائی نہ دیتی ۔ چشموں پر رنگین لبادوں میں لپٹی ہوئی عورتوں کی مجلسیں گرم نہ ہوتیں ۔ جھرنوں پر کپڑے نہ دھوئے جاتے ۔ اُن کی زندگیوں کا معمول درہم برہم ہو چکا تھا ۔ تنہائیاں مسلط تھیں اور ان کے تدارک کا کوئی راستہ نہ تھا ۔ جلّی پوری بہت ویران زندگی گزار رہے تھے ۔

اسی طرح کچھ عرصہ گزر گیا ۔ راجہ بھوکے درندے کی طرح گھر گھر جھانکتا ۔ چشموں پر تاکتا کھیتوں کے چکر لگاتا ۔ اسے پوری وادی میں کوئی عورت، کوئی بچی تک نظر نہ آتی ۔ اس نے کئی دفعہ گھاس اور ٹہنیوں سے بنے ہوئے بڑے پل کو عبور کر کے دریا کے پار جانے کی کوشش کی مگر نیچے بہتے دریا کے تیز دھارے سے ایسا چکرایا کہ گرتے گرتے بچا ۔ رسی تھام کر، آنکھیں موند کر، سمت ٹٹولتا پلٹا اور بھی عورتیں محفوظ نہ رہتیں ۔

وہ ایک بہت ہی حسین صبح تھی ۔ سورج پہاڑوں کے اُوپر آہستہ آہستہ اُٹھ رہا تھا ۔ وادی سرسبز و شاداب، تازہ تازہ ہوا میں لپٹی، پھلوں اور فصلوں کی مہک سے رچی بسی نکھری نکھری لگ رہی تھی ۔

شہزادی کی سب سہیلیاں اور ہم جولیاں جا چکی تھیں ۔ اس کے اپنے ہی بھائی کے خوف سے محل خالی تھا اور گاؤں ویران ۔ سب جا چکی تھیں ۔ دریا کے پار پردیس میں ۔ کبھی کبھار کوئی مسافر آتا تو ان کی خیریت کی اطلاع مل جاتی ۔ مگر پھر مہینوں گذر جاتے ۔ شہزادی بہت اُداس تھی ۔ اس کی خوبصورت سیاہ آنکھوں میں ہلکے آنسوؤں کی نمی تھی ۔ ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ منجمد تھی ۔ دمکتا رنگ ماند پڑ رہا تھا ۔

آج وہ سیاہ ٹوپی اور سفید لباس میں ملبوس، دریا کے کنارے ایک چٹان پر بیٹھی سوچ

میں گم تھی۔ وہ اپنا چہرا ہتھیلیوں میں تھامے دریا کی لہروں کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس نے ان کے ملاپ کو دیکھا اور اپنی تنہائی کو سوچا۔ ان کو سفر کتنا لمبا ہے۔ پھر بھی کوئی لہر دوسرے لہر سے ایک لمحہ کے لئے بھی الگ نہیں ہوتی۔ مگر میں کتنی اکیلی ہوں! کتنی ویران! کتنی اجڑ پجڑی!''

اس کے لانبے لانبے بال اس کے شانوں پر بکھرے تھے۔ مخروطی انگلیاں ریت میں نقش و نگار بناتیں۔ پھر وہ انہیں ہتھیلی پھیر کر مٹا دیتی ایک پرندہ آیا ''ٹسکا'' چھوٹا سا۔ خوبصورت رنگین پروں والا۔ ''پھر درڈ'' سے وہ دریا کے کنارے ایک چوڑے پتھر پہ جا بیٹھا۔ اُس نے چونچ نیچے کی۔ پانی چکھا۔ اپنا عکس دیکھا۔ گردن نیچے ہوتی اور کبھی دم اونچی، کبھی دُم نیچے اور گردن اونچی اس کے رنگین پر، معصوم حرکتیں اور منا سا پھدکتا بدن دیکھ کر شہزادی کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اس نے انگڑائی لی۔ ٹوپی اتاری، پتھر پر رکھی آنچل سنوارا۔ درخت سے ٹانگا۔ لانبے سیاہ بالوں کو جھٹکا دیا۔ اس کا افسردہ دل مچل اٹھا۔ چہرے پر رونق آ گئی۔ روح میں پیار جاگ اُٹھا۔ رخسار دہکے۔ ہونٹ مسکائے اور دانتوں کی سفید لڑی بولی ''قل قل قل'' وہ خود بخود ہنس دی فضا کا رنگ بدل گیا۔ چڑھتے سورج کی کرنوں نے گدگدی کی۔ درختوں کی جھکی شاخ نے پیشانی پر بوسہ دیا۔ ہلکی ہوا نے زلفوں کو چھیڑا۔ ''سر سر سر۔''

''شڑپ شڑ شڑپ'' دریا کی لہریں ساحل سے ٹکرائیں۔ انہوں نے شہزادی کے پاؤں گدگدائے۔ ''ہم سے کھیلو''۔

''قدرت میرے ساتھ ہے۔ یہ سب میرے دوست ہیں۔ میں اکیلی نہیں ہوں۔ شہزادی نے سوچا۔

وہ مخملی گھاس پر لیٹ گئی۔ اس نے کروٹ لی چہرہ جھکایا۔ ایک چھوٹے سے نازک سے جنگلی پھول کو سونگھا۔ خوشبو! اس نے آنکھیں موندلیں۔ اس کا ذہن اونچے ہی اُنچے پرواز کر رہا تھا۔ اس کے سارے چہرے پر لطیف مسکراہٹ تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اُٹھی۔ اپنا لبادہ اتارا۔ اپنے عریاں جسم کو دریا میں منعکس دیکھا۔ اب وہ ''شڑاپ'' سے لہروں سے گلے مل رہی تھی۔

غسل سے فارغ ہو کر وہ باہر نکلی۔ بال جھٹکے۔ لبادہ پہنا۔ آنچل اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تھا کہ ''غرغرغر ساساش'' آواز آئی جیسے کسی کا سانس چڑھ رہا ہو۔

اس نے چاروں طرف دیکھا۔ کوئی نہیں تھا۔ کوئی درندہ ہوگا! شہزادی نے سوچا اور بے خوفی سے ٹوپی اٹھانے کو آگے بڑھی۔ وہ درندہ ہی تھا۔ اس کا بھائی۔ راجہ۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپا بیٹھا کلب سے اپنی بہن کو گھورے جا رہا تھا۔ شہزادی ٹوپی اٹھانے جھکی تو راجہ کی انسانیت پوری طرح دم توڑ چکی تھی۔ اس نے ایک جست لگائی اور اپنی ہی بہن کو دبوچنا چاہا۔ شہزادی چونکی، گھبرائی۔ چیخی۔ چلائی۔ اس نے پوری قوت سے ہاتھ جھٹکا اور سرعت سے ٹوپی راجہ کے دے ماری۔ پھر وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ وہ قلانچیں بھرتی بھاگتی جا رہی تھی۔ اس کے ننگے پاؤں پتھروں سے ٹکرائے مگر نالیاں پھلانگتی، اٹ پار کرتی، کھیتوں میں سے گذرتی بھاگتی چلی گئی۔ مگر آگے آگے وہ تھی وہ پیچھے راجہ تھا۔ اس کا بھائی۔ سورج جیسے ٹھٹھک کر رہ گیا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے دم سادھ لیا۔ جھرنے رو دیئے۔

''کوئی ہے! اور مدد کرو!'' شہزادی کا کربناک بُگا اٹھا، پہاڑ سے ٹکرایا اور گونجتا ہوا جلی پور کے کونے کونے میں پھیل گیا۔

''یہ کیسا بگا ہے اے دیوتا؟'' جلی پور کے مرد، بوڑھے اور لڑکے سبھی گھروں سے باہر نکل آئے۔

شہزادی پہاڑ کے دامن میں پہنچ چکی تھی۔

''میں کہاں جاؤں!'' اس نے مڑ کر، رکے ہوئے مفلس، بے بس بے طاقت، جلی پوریوں کو دیکھا۔ ان کی پھیلی ہوئی خائف آنکھوں میں جھانکا ''کوئی نہیں''۔ اس نے سسکی بھری اور پلٹ کر پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا۔

اے پہاڑ تجھے تیری تقدیس کا واسطہ۔ مجھے بچا۔ مجھے اس درندے سے بچا۔ درندگی اور پھر اپنے ہی خون میں! ساتھ کے جنے میں۔ میں اسے کیسے سمجھاؤں کہ تو میرا بھائی ہے۔ اسے انسانیت اور وحشت میں کوئی تمیز نہیں۔ وہ درندگی اور آدمیت میں امتیاز کر ہی نہیں سکتا۔ یہ سوچتی ہوئی وہ گرتی پڑتی بھاگتی چلی جارہی تھی۔ کنکر اس کے تلوؤں میں سوراخ کیے دے رہے تھے۔ اس کے پاؤں سے خون رس رہا تھا۔ اس کے جسم سے طاقت کا قطرہ قطرہ اور اس کے ذہن سے سوچ کا لمحہ لمحہ جیسے سمٹ کر ایک ہی نقطہ بن گئے تھے ''مجھے اس درندے سے اپنے آپ کو بچانا ہے۔ ہر صورت میں۔ ہر قیمت پر۔''

اس کے ہاتھ پر اور بازو سرعت سے چل رہے تھے۔ وہ پتھروں کو چھبتے کونوں اور کاٹتے کناروں کو پکڑتی، اونچا چڑھتی چلی جارہی تھی۔ اس کی انگلیاں زخمی تھیں۔ کہیں کہیں چٹیل چٹانوں پر جمے ہوئے گذشتہ سردیوں کی برف کے یخ ٹکڑے اسے وقتی سہارا دیتے۔ ان پر وہ اپنے پھسلے پاؤں کی خون آلود انگلیاں پھنساتی، جسم کو گھسیٹتی اور اس طرح اور اُوپر اُٹھ جاتی۔

''میں کہاں جارہی ہوں؟ کس کے پاس؟'' وہ سسکی ۔مگر پھر اس کے اندر سے ایک سرگوشی ابھری ۔''تمہارے لئے پناہ ہے ۔تمہیں چوٹی پر پناہ ملے گی ۔پہاڑ کی چوٹی'' اس کی روح کی اتھاہ میں قوت کی لہریں اٹھیں ۔اُمید کا نور چمکا ۔اعتقاد کی طاقت اُبھری اور وہ چڑھتی چلی گئی ۔

سورج چوٹی کے قریب پہنچ چکا تھا ۔وقت، فاصلے، بلندی، تھکن سے بے خبر وہ بڑھتی گی ۔مقدس بلندی کی جانب ۔اسے اپنے عقب میں چڑھتی سانسوں کی آوازیں آرہی تھیں ۔بھاری جسم کے چٹانوں پر پھسلنے اور ٹکرانے کا شور اٹھ رہا تھا ۔

ایک بار پھر مقدس سرگوشی ابھری ''مجھے تک ایک بار پہنچ جاؤ ۔محنت اور ریاضیت تمہارا کام ۔اور تمہاری حفاظت ہمارا کام ۔کوئی تمہیں چھو بھی نہ سکے گا ۔

''میں ضرور پہنچوں گی'' ۔شہزادی کے اندر سے آواز آئی ۔

اس نے ہتھیلیوں پر پورا دباؤ ڈالا، جسم کو گھسیٹا، پاؤں پر پوری قوت صرف کر دی ۔اور اس طرح آخری بلندی بھی پھاند گئی ۔

ہوا تند ہوئی جارہی تھی ۔اس کے لانبے بال اس کی پیشانی اور کندھوں سے ہٹ کر اس سے دور اڑے جارہے تھے ۔لبادہ جسم کے ساتھ چپک کر پیچھے کی طرف اڑ رہا تھا اور ہلکے ہلکے جھٹکوں سے اس کے وجود کو کھینچ رہا تھا ۔جب وہ قدم آگے بڑھاتی تو ہوا کی مخالف قوت سے لڑکھڑا جاتی ۔

پھر وہ سسکتی ہوئی پکاری ۔''میں تمہاری گود میں ہوں ۔میں چوٹی پر آگئی ہوں ۔اب مجھے سہارا دو ۔اب مجھے اپنی تقدیس کے دامن میں چھپا لو ۔مجھے پناہ دو ۔''

ساری قدرت جیسے جنبش میں آ گئی۔ فضا میں روشنی بجھنے سی لگی۔ آسمان تاریک بادلوں سے ڈھک گیا۔ بادل تیزی سے گھومتے ہوئے ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ مسلسل گرج چمک سے ''جلی پور'' کی وادی دہل گئی۔ جب بجلی کڑکڑاتی ہوئی چمکتی تو ایک ساعت کے لئے چندھیا دینے والی روشنی میں جلی پور کے لوگ ایک دوسرے کے خوفزدہ چہرے دیکھتے۔ پھر سیاہی مائل فضا میں انہیں اپنے ہیولے ہی نظر آتے۔ انہوں نے فضا کو خنک سے خنک تر ہوتے محسوس کیا۔ پھر بارش کے قطرے ان پر برسنے لگے۔ خنکی یخ ہونے لگی۔ اولے اور پھر نرم برف آہستہ آہستہ گرنے لگی۔

یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ اور جلی پوری دم سادھے کھڑے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

بھاری قدموں کو گھسیٹتا، گرتا پڑتا راجہ چوٹی تک پہنچا۔ اس نے سنگلاخ چٹانوں کے آخری کونوں کو پکڑا۔ اپنا جسم گھسیٹتا اوراوپر چڑھ گیا۔ اب وہ چوٹی پر کھڑا تھا۔ اس کے ناپاک قدم مقدس چوٹی کے سینے پر تھے۔

''دھام دھم دھام'' بادل پھٹ گئے۔ مگر چوٹی پر برف باری مسلسل ہوتی رہی۔ تند ہواؤں کے جھکڑ چلتے رہے۔ ساری رات یہی عالم رہا۔ دوسرے دن عجیب نظارہ تھا۔ وادی میں دھوپ اور خوشگوار خنکی تھی۔ مگر ''رڑا گاسں'' کی چوٹی پر بادل تند ہوائیں اور برفانی طوفان جوش میں آئے ہوئے تھے۔

یہ سلسلہ پورا ہفتہ جاری رہا۔ چوٹی پر اَب برف ہی برف تھی۔ اُوپر چڑھنے کی سب راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ برف کی اس سفید دنیا میں سب کی پہنچ سے باہر راجہ اور شہزادی دونوں گم تھے۔ ان کے انجام کی خبر کسی کو نہ ہو سکتی تھی۔ چوٹی پر برف ہفتوں لگاتار پڑتی رہی۔ پھر سرما شروع ہو گیا۔ جلی پور اور رائے کوٹ کے گاؤں برف سے

سفید ہو گئے ۔اس سال شدید سردی پڑی۔ دریا سفید موٹی چادر تان کر سو گیا۔ جلی پوری گھروں کے اندر مقید ہو کر رہ گئے ۔ برف باری کا سلسلہ ہفتوں بعد منقطع ہوتا مگر وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے اور انہیں اتنا وقت بھی نہ ملتا کہ چھتوں کو اچھی طرح صاف کر سکیں۔ وہ پتھریلے گھروں کے اندر دبکے بیٹھے دیوتا سے رحم کی دعائیں مانگتے رہتے ۔ ان کے دل خدشات سے پر تھے ۔شہزادی کے متعلق ہر دل میں تشویش تھی ۔راجہ کا غائب ہو جانا اس کے خانوادے کے لئے باعثِ فکر تھا۔اب کون گدی نشین ہوگا؟ اس کے تو اپنی کوئی اولاد ہی نہیں؟ یہ سوال انہیں پریشان کئے ہوئے تھا۔

پھر ہوا یخ بستہ نہ رہی ۔ بارشوں کا زور رہا۔ برف پگھلنی شروع ہوگئی ۔جھرنوں میں پانی رواں ہوگیا۔ کھیتوں کی مٹی نکل آئی ۔چمکتی دھوپ میں جلی پور نکھر گیا۔

اس دن سورج چمک رہا تھا۔جلّی پور کے مرد، بوڑھے،لڑکے سبھی باہر تھے۔وہ اُٹ مرمت کرنے اور کھیت درست کرنے اور گھر کی لپائی میں مصروف تھے ۔ ان کی نظریں رہ رہ کر پہاڑ کی چوٹی کی جانب اُٹھتیں مگر سفید دھند اور بادلوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا۔

پھر یکدم سورج سے ایک کرن نکلی ۔روشن اور چمکدار ---وہ سیدھی چوٹی پر جا چمکی ۔دھند چھٹ گئی ۔چوٹی آفتابی نور میں نہا گئی ۔ یہ نور بکھر کر جلی پور پر برسا۔فضا کچھ زیادہ ہی روشن ہوگئی اور تمازت بڑھ گئی۔

"یہ دھوپ میں اتنی چمک کیسے"؟؟ سب چونکے ۔ سب نے نظریں اٹھائیں اور چوٹی پر دو مجسمے استادہ تھے۔پتھریلے۔ساکت ایک شہزادی کا۔دوسرا راجہ کا

پھر جلی پوریوں کو ایسے لگا جیسے حدِ نگاہ مٹ گئی ہو۔ ان کی نظریں فاصلے کی قید سے آزادی ان دو مجسموں کو جیسے قریب سے دیکھ رہے ہوں۔ وہ ان پتھر کے چہروں پر منجمد کیفیتوں کو محسوس کر رہے تھے۔ شہزادی کی آنکھوں میں محبت کا تاثر تھا۔ جو اپنے رفیق کو دیکھ لینے سے پیدا ہوتی ہے۔ ہونٹوں پہ پرسکون ہلکی مسکراہٹ تھی۔ ذرا سے اٹھے ہوئے ہاتھ اور آگے بڑھا ہوا قدم، خوش آمدید کا انداز لئے تھا۔ ہوا اس کے بال پشت سے اُٹھ چکے تھے اور لبادہ مخالف سمت کا رُخ کئے، اس کے جسم سے پیوست، ساکت تھا۔

راجہ کا وجود پہاڑ کی چوٹی پر ایسے نصب تھا جیسے کوئی اچانک رک گیا ہو۔ اس کی آنکھیں دہشت میں ایسے پھیلی ہوئی تھیں۔ جیسے کسی درندے کی آنکھیں موت کو سامنے دیکھ کر پھیل جاتی ہیں۔

جلّی پور کے لوگ سکتے کے عالم میں میں کھڑے قدرت کے اس فیصلے کو دیکھتے رہے۔ ان کی حیران آنکھوں اور پھیلے ہوئے ہونٹوں کے کونوں پر خوف کی کوئی علامت نہ تھی۔ ان کے ذہنوں پر ایک عجب تاثر تھا، ''چوٹی کے مظلوم کی مدد کی۔ اس نے اسے پناہ دی اور ظالم کو سزا دی۔ اپنی سرزمین پاؤں رکھنے کی۔''

یہ احساس ان کے لئے تحفظ بخش تھا۔ ان کی عورتیں، مائیں، بہنیں، بیویاں واپس اپنے گھروں کو لوٹ آئیں۔ اس گرما میں ''جلی پور پر مسرت ہنگاموں سے گونجتا رہا۔ لوگ گرم جوشی سے کام کرتے رہے۔ فصلیں اچھی ہوئیں۔ امن واطمینان رہا۔

اس سال راجہ کے خانوادے کے لوگ سہمے سہمے سے رہے۔ وہ گھروں سے باہر کم نکلے۔ بیگار کم لی۔ راج گدی خالی رہی اور راجہ بننے کوئی آگے نہ آیا۔ دوسرے سال

ایک کم سن بچے کو راجہ بنایا گیا۔

آج بھی اگر دور ہوئی جہاز کی بلندی سے اس چوٹی کو دیکھیں تو اس پر دو بڑے پتھر نظر پڑے آتے ہیں۔ یہ پتھر دو مجسمے لگے ہیں۔ ایک عورت کا اور دوسرا مرد کا۔ انہیں کی مناسبت سے چوٹی کا نام ''رڑا گا سس'' رکھا گیا ہے۔ ''رڑا'' کے معنی ہیں ''بہن'' اور ''سس'' مقامی زبان میں ''بھائی'' کو کہتے ہیں ''گا'' کے معنی ''اور'' رڑا گا سس'' ----''بہن اور بھائی!''

ہپر نگ کور

ضلع دیعامر میں ایک پہاڑ ہے جس کا نام ہے ''ہپر نگ کور'' --- ''ہپر نگ'' نام ہے اور ''کور'' چیلاسی زبان میں پہاڑ کو کہتے ہیں ۔ یہ تقریباً ۱۶۰۰۰ فٹ بلند ہے ۔ اس پر چڑھنے کا راستہ دشوار گذار اور بیکار ہے ۔ نہ خوبصورت مناظر ، نہ ٹھنڈے چشمے ، نہ سایہ دار درخت ، نہ تو پانی بس پتھر ہیں ۔ بھربھری مٹی اور کنکروں سے اٹی پگ ڈنڈیاں ہیں اور پھلتے راستے ہیں ۔ چوٹی تک پہنچتے پہنچتے آدمی بے دم سا ہو جاتا ہے ۔

میں نے دم لیا ۔ پھر اُٹھی کہ گرد و نواح کا نظارہ کرسکوں ۔ میرے سامنے ایک سحر انگیز منظر تھا ۔ اتنا انوکھا ، اتنا نرالا کہ میں اسے دم بخود دیکھتی رہ گئی ۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ہندوکش ، ہمالیہ اور قراقرم کے تین عظیم سلسلے ایک دوسرے سے ملتے اور بچھڑتے ہیں ۔ سمٹا ہوا ہپر نگ کور ، ہٹ کر الگ کھڑا ہے شاید اس لئے کہ یہاں سے اس منظر کا نظارہ کیا جا سکے ۔

دور حد تک بادلوں اور دھند کا اک وسیع اور ساکت سمندر ہے ۔ اس میں جابجا ابھری ہوئیں پہاڑوں کی چوٹیاں ہیں ۔ کوئی چھوٹی ، کوئی بڑی ، انہی میں ''ہراموش'' ، ''دوبانی'' ، ''راکاپوشی'' ''چیغولیزا'' اور ''کے ٹو'' جیسی مانوس اور نامور بلندیاں ہیں ۔ چوٹیوں کے اس لامتناہی سلسلہ میں ان کی نشان دہی ممکن نہیں ۔ وہ انہی میں گم کہیں موجود ہیں ۔

میں بہت دیر تک اس منظر کو دیکھتی رہی ۔ سفید دھند اور بادلوں میں معلق چوٹیوں کے

اس بے کنار سمندر نے میرے ذہن پر ایک عجیب تاثر مرتب کیا۔

تھک کر میری نگاہ لوٹ آئی۔ اب کے جو اٹھی تو سامنے کھڑی فصیل سے جا ٹکرائی۔ میرے سامنے ''دیعامر'' تنا کھڑا تھے۔ ۲۶۰۰۰ فٹ بلند یہ پہاڑ چوٹی سے دامن تک صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے دامن میں بے آب و گیاہ تنگ سی وادی تھی اس کی ناف پر سر سبز جنگل تھے۔ اس کے کندھوں پر سنگلاخ چٹانیں تھیں اور اوپر برفیلی چوٹی جو سدا سفید رہتی ہے۔

دیعامر ہیر نگ کور سے چند میل کے فاصلے پہ تھا۔ ان دونوں کے درمیان کچھ بھی نہ تھا بس اتھاہ گہرائی اور گہرے کھڈ۔ ہیر نگ کور کی دیعامر والی سمت کچھ یوں ہے جیسے دیوتا نے، دیوتائی تیشے سے اُسے یکدم کاٹ دیا ہو۔ چند ہزار فٹ تک سپاٹ گہری چٹانیں، پھر بڑے بڑے پتھر، بھُر بھری ریت اور کنکروں سے مزین عمیق کھڈ کسی بھی کوہ پیا کے لئے ہیر نگ کور کی دیعامر والی سمت۔ سے نیچے اُترنا ممکن نہ تھا۔

ہیر نگ کور کے دامن میں ''گور'' کا گاؤں ہے۔ اہل گور سے وابستہ ایک عجیب محاورہ ہے جو وادی چیلاس میں اکثر استعمال ہوتا ہے۔

''اہل گور کو اپنے بزرگوں کی کیا فکر۔ وہ تو انھیں ضعیف ہوتے ہی ہیر نگ کور سے نیچے دھکیل دیتے ہیں''۔

اس محاورے سے وابستہ یہ ایک عجیب داستان ہے۔

شنور جان جب پاؤں آگے بڑھاتی تو پاؤں کے پہناوے کے تلوں سے کنکریاں پھسل پھسل کر نیچے گرتیں اور پیچھے آنے والوں کے پاؤں سے ٹکرا جاتیں۔ وہ سر جھکائے چلتی جا رہی تھی۔ زندگی کا آخری دن بھی کتنا عجیب ہوتا ہے۔ جب موت

سامنے ہو تو ذہن خالی سا ہو جاتا ہے۔ نہ خوف کا احساس رہتا ہے نہ خواہش کا جوش جیسے ذہن ساکت ہو گیا ہو اور جسم و روح خود بخود کام کر رہے ہوں۔

سازندوں کے نغمے اور نوبتوں کی "دف دف" لحظہ بہ لحظہ کم ہوئی جا رہی تھی۔ بچوں کے چیخ پکار اور گاؤں والوں کے شور کا تاثر ابھی فضا میں موجود تھا۔ نادر جان ماں کے قریب ہو گیا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر گہرے سانس لیتا جیسے ماں کے جسم کی خوشبو کو جی بھر کے اپنے اندر بھر لینا چاہتا ہو۔ آخری بلندی سب نے مشکل سے پار کی۔ بہت جگہوں پر ماں کو سہارا دینا پڑا۔ کئی جگہوں پر اسے کندھوں پر بھی اُٹھانا پڑا۔ چوٹی پر پہنچتے ہی سب بے دم ہو کر بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے شنور جان اُٹھی، اُس نے لباس سیدھا کیا۔ سر پر ہاتھ پھیرا۔ اوڑھنی درست کی اور نادر جان کو دیکھ کر ہولے سے مسکرائی اس کی آنکھیں جیسے کہہ رہی ہوں "اُداس نہ ہو بیٹا"

نادر جان نے بے بسی سے موڑ لیا۔

شنور جان چلتی چلتی پہاڑ کی نکڑ تک آئی۔ اُس نے دائیں بائیں پھیلے پہاڑوں کے لامتناہی سلسلوں کو دیکھا۔ دھند اور بادلوں کے سمندر میں جابجا! ابھری ہوئی، چھوٹی، بڑی بے شمار چوٹیوں کو دیکھا۔ پھر اس کے نگاہ سامنے کھڑے اونچے بلند و بالا دیعامر سے جاٹکرائی۔ اُس کا بے حس ذہن جیسے جاگ اُٹھا۔ آنکھوں میں حیرت کا تاثر اُبھرا۔ وہ دیعامر کو گھورتی چلی گئی۔ نظریں اُس کی بلندی ناپتی اوپر اُٹھتی گئیں اور گردن پیچھے کو جھکتی گئی ۲۶۰۰۰ فٹ دیعامر سیدھا تنا کھڑا تھا انتہائی گہرائی میں دھند اور بادلوں کی جھیل سے شروع ہوتی ہوئی اس کی پستی تھی۔ پھر یہ بلندی اپنے اوپر چیل کے گھنے درخت لئے وہ ننگے کندھے جن کے سنگلاخ چٹانیں ہر رنگ کور سے صاف نظر آ رہی تھیں۔ اور اوپر یہ برف کی چوٹی جس پر سدا برف جمی رہتی تھی۔

شنور جان نے گردن سیدھی کی۔وہ کافی دیر سامنے تنے دیعامر کی ناف کو گھورتی رہی ۔اس کی عظمت جیسے اُسے حوصلہ دے رہی ہو۔

ہر نگ کور اور دیعامر کے درمیان کچھ بھی نہ تھا۔، جھانکو تو میل بھر سنگلاخ چٹانوں کے بعد کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔بس دھند اور سفید بادموں کی خاموش جھیل تھی۔

باری باری سب آگے ہوئے۔انھوں نے جھک کر شنور جان کہ ہاتھ چومے۔دعالی ۔نادر جان نے بھی ماں کا ہاتھ چوما۔اُسے چھوڑا۔پلٹا۔ہوا چل رہی تھی۔شنور جان کی اوڑھنی وہا میں اُڑ رہی تھی۔تھپیڑے کھاتی وہ پیچھے بھاگی اور مڑتے ہوئے نادر جان کے چہرے سے ٹکرائی۔نادر جان کے بے اختیار اوڑھنی کا کونا پکڑ لیا۔بھینچ کر جیسے وہ بچپن میں پکڑا کرتا تھا۔ماں کاموں میں لگی رہتی اور وہ کونا پکڑے اُس کے پیچھے پیچھے چلتا۔کبھی دانتوں سے کُتر بھی لیا کرتا۔شنور جان کو اوڑھنی کے کونے اکثر پھٹے ہوتے ----''نیک بخت جان'' وہ اُسے دیوتا کو یاد اور کو دگئی۔

''کھٹک'' نادر جان کے ہاتھ کو جھٹکا لگا۔اوڑھنی کا کونا چھوٹا۔ماں پستی میں کبھی کی گم ہو چکی تھی۔اُس کی اوڑھنی پھولے ہوئے زرد، زرد تنبو کی طرح آہستہ آہستہ وہا کے گدیلے پر سوارے اُڑتی رہی، دور ہوتی رہی، سمٹتی گئی، اور پھر ایک چھوٹی سی پتنگ کی طرح گرتی دھند کی وادی میں کھوگئی۔زرد رنگ کا ایک ذرہ نادر جان کی آنکھوں کے آگے ناچ رہا تھا۔اُس نے آنکھیں موندیں آنسوؤں کے قطرے گرے۔پلکیں چھپکائیں اور آنکھیں کھولیں تو دور حد نگاہ تک کچھ نہ تھا۔شاندار برفیلی چوٹیاں، نیچے دھند کے بادل، اور ان کی تہہ میں کھوئی ہوئی عجیب دنیا جس کا کسی کو پتہ نہ تھا۔صرف اہل گور کے بزرگوں کی لاشیں ہی یہاں تک پہنچ سکتی تھیں۔آج تک کوئی زندہ ہر نگ کور سے اُتر کر نیچے وادی میں نہ گیا تھا۔

۱۶ ہزار فٹ بلند ہیر نگ کور کے دامن میں یہ چھوٹا سے گاؤں تھا۔ ''گور'' مختصر سی آبادی تھی ۔محدود سے وسائل تھے ۔کچھ کھیت، کچھ پھلدار درخت اور بس ۔ان کا مالک تھا گور کا راجہ جس کے احکام سخت تھے ۔ان کی تائید کے بغیر زندہ رہنا ناممکن تھا ۔ یہاں کی آب و ہوا صحت مند تھی ۔طرز زندگی سادہ تھا ۔پھلوں اور سبزیوں کی فراوانی کے باعث لوگوں کی عمریں بہت لمبی ہوتی ہیں ۔۱۰۰ یا ۱۵۰ سال جی لینا عام بات تھی ۔۸۰ برس کے بعد لوگ زندہ تو رہتے مگر علاقائی آمدنی میں اضافہ اُن کے بس کی بات نہ تھی ۔اُن کو وجود گور کے محدود ذرائع پر ایک بوجھ بن کر رہ جاتا۔

''انھیں کھلاتے جاؤ اور ان کو موت کا انتظار کرتے رہو۔ بیکار کے بڈھے مرنے کا نام نہیں لیتے'' راجہ نے سوچا ۔پھر ایک دن اُس نے حکم صادر کر دیا۔ ''۹۰ سال کے بعد کسی کو جینے کا حق نہیں ۔۹۰ سال کا ہر فرد ہیر نگ کور کی چوٹی پر لے جایا جائے اور اسے نیچے دھکا دے کر ختم کر دیا جائے۔''

۱۶ سالہ راجہ کا یہ حکم سارے گور کو ماننا پڑا ۔گھر گھر صفِ ماتم بچھی ۔کچھ لوگوں نے اپنے بزرگوں کو چھپانے کی کوشش بھی کی ۔پھر آخر سب کو اس ناگہانی حکم کے آگے جھکنا پڑا۔اُس سال آٹھ بوڑھیاں ہیر نگ کور پر لے جائی گئیں اور انھیں نیچے دھکیل دیا گیا۔

ان بچوں اور ان کی پوتے پوتیوں نے یہ منظر دیکھا۔وہ کرب سے تڑپ اُٹھے، دکھ دلوں میں اُبلا ہونٹوں تک آیا مگر آہ تک نکالنے کی جرأت نہ ہوئی۔آنسو آنکھوں میں بھرے رہے مگر قطرہ بن کر باہر نہ ٹپکے ۔پھر وہاں یہ دستور ہی بن گیا۔ ۹۰ سالہ بڈھی یا بڈھا ہیر نگ کور لے جایا جاتا اور چوٹی پر سے نیچے دھکیل دیا جاتا۔

آج مدتوں بعد نادر جان کی ماں کی باری تھی ۔دستور کے مطابق شنور جان کو تیار کیا گیا ۔ڈھول ڈھما کے سمیت سارا گاؤں ہپر نگ کور کے وسط تک آیا۔پھر دوست،عزیز دکھ بانٹنے چوٹی تک ساتھ رہے ۔شنور جان کے گرنے کے بعد سب نے نادر جان کے گھر کا رخ کیا۔راستے میں نادر جان کے چپکے سے پگڈنڈی پکڑ لی اور جھرنے پر جا بیٹھا----جھرنا جس پر سے صبح ہی اُس کی ماں سب گھر والوں کے لئے پانی لے کر گئی تھی ۔وہ اکیلا،اداس سوچ میں گم بیٹھا رہا۔گھر نہ گیا۔

گھر والوں سے بھرا ہوگا۔صف ماتم بچھی ہوگی ۔مرنے والی کی یادیں ہوں گیں ۔ جن بڈھوں کی اگلے سال باری آنی ہے وہ سراسیمہ قطار باندھے بیٹھا رہا۔گھر نہ گیا ۔

گھر لوگوں سے بھرا ہوگا ۔صف ماتم بچھی ہوگی ۔مرنے والی کی یادیں ہوں گیں ۔ جن بڈھوں کی اگلے سال باری آئی ہے وہ سراسیمہ قطار باندھے بیٹھے ہوں گے ۔ ان کے عزیزواقارب سب سے زیادہ رو رہے ہوں گے ۔میرا دکھ تو اتنا گہرا ہے، چوٹ اتنی سخت ہے کہ تنہا ہی سہنی پڑے گی زندگی دیوتا کا تحفہ ہے ۔اُس نے دیا۔اُسی مدت مقرر کی، زندہ رہنے کی اور مرنے کی بھی ۔روزی کا بندوبست بھی اُسی کے سپرد ہے ۔پھر راجہ کو کیا اختیار ہے کہ یہ دیوتائی تحفہ ہم سے یوں چھین لے----محض راجائی زور کے بل پر ۔'' نادر جان نے سوچا ۔اُس کی کمر کے گرد، لباس کے نیچے چمڑے کا ایک موٹا تسمہ بندھا تھا جس پر اُس کی عمر کی گرہیں لگی تھیں ۔ہر سال جب نیا چاند چڑھتا وہ ایک گرہ اور لگا لیتا ۔اُس نے تسمے کو کھولا، گرہیں گننی شروع کیں ۔ ''چالیس، زندگی کے پچاس سال اور رہ گئے ہیں ۔پھر ہم نہ ہوں گے ۔ ہمارے لئے ہپر نگ کور ہوگا اور اس کا اتھاہ گہرائی ۔راجہ بھی تو ۹۰ برس کا ہو جائے گا۔پھر وہ کیا

کرے گا؟ کیا ہماری موت اور زندگی پر یونہی راج کرتا رہے گا۔'' نادر جان نے سوچا۔آہ بھری۔غم آلود آنکھوں کو انگلیوں کو پوروں سے صاف کیا۔ تسمے کو کمرے سے باندھا۔چوغا نیچے کیا اور سر اٹھایا۔اُس کی نظر اپنے بیٹے پر پڑی۔اُس کا سترہ سالہ بیٹا محبوب جان نجانے کب کا کھڑا اپنے باپ کو دیکھے جارہا تھا اُس کے چہرے پر محبت اور غم ک املاجلا تاثر تھا۔

''میں تمہیں یوں نہ مرنے دوں گا۔ مجھے دیوتا کی قسم۔راجہ کا حکم رہے اپنی جگہ جیسے چپکے سے تم نے اپنی ماں جانے دی۔میں تمہیں کبھی نہ جانے دوں گا۔محبوب جان نے کہا۔

نادر جان نے چونک کر اپنے بیٹے کو دیکھا اُس کے اُداس چہرے پر عزم کی جھلک تھی اور آنکھوں میں دلیری کی چمک۔ہونٹوں کے گرد چھوٹی لکیریں اور جبڑوں کی بھنچی ہوئی ہڈیاں اٹل فیصلے کا تاثر لئے تھیں۔

نادر جان مسکرایا۔اپس نے پیار سے بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور واپس ہولیا۔ اس ایک جملے نے ہی اس کا غم آدھا کر دیا تھا۔

دن گذرتے گئے۔نادر جان کی کمر سے بندھے تسمے پر گرہیں زیادہ ہوتی گئیں۔آج راجہ کے محل کی چھت سے برف ہٹاتے، پھاوڑا سمیٹتے اس کی ٹانگیں ہلکے ہلکے لرز رہی تھیں۔ہاتھوں اور پاؤں میں خفیف لرزہ تھا۔اس نے بمشکل کام ختم کیا۔ تھکاوٹ کی آہ کو اندر ہی اندر دبایا، چہرے پر مسکراہٹ طاری کی اور راجہ کے حواری سے پوچھا۔''اور بھی کچھ حکم ہو تو فرمائیے۔چھتیں تو صاف ہوگئیں۔

''تم تھکے نہیں کیا؟؟ ان نوجوانوں سے بھی زیادہ پھرتیلے ہو!! کمال ہے !!!''

حواری نے نادر جان کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''ابھی تو تھوڑی، ہمت باقی ہے۔'' نادر جان نے منجمد مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا ۔واپسی پر اس کا دل اُداس تھا۔وہ سیدھا گھر کے اندر نہ گیا، برف سے اَٹے خرمانی کے درخت کے نیچے کھڑا سوچنے لگا۔کمر سے چمڑے کے تسمے کو کھولا، گرہوں کو گنا۔ ''۹۷ سال اور ۱۱ مہینے۔بس ایک ماہ رہ گیا ہے۔اس ایک ماہ اور بھی کیا جینا۔'' ''گور'' کا کچھ عجب ماحول ہے۔باہر نکلتا ہوں تو نوجوانوں سے زیادہ چہرے پر شگفتگی، کمر میں تناؤ اور بازوؤں میں زور دکھانا پڑتا ہے۔پھر بھی یوں لگتا ہے جیسے سب میرے چہرے کو جانچ رہے ہیں۔ساری جوانی یہاں گذار دی۔گور اور اہل گور کے لئے لاتعداد کام کئے۔راجہ کی زندگی آرام دہ بنانے کے لئے بے حد تگ و دو کی پھر مجھے اپنے بڑھاپے کے چند سال کا بھی آرام نصیب نہیں۔میرے گردونواح بسنے والوں سے سرد مہری کی لہریں اُٹھتی ہیں۔''جاؤ تمہاری ضرورت نہیں'، جیسے سارا ماحول ہی کہہ رہا ہو۔اب تو زندگی خود بھی مشورہ دینے لگی ہے۔''آؤ موت کے پاس چلیں اب اور جینا مناسب نہیں''

''دیر ہوگئی بابا واپس نہیں آئے۔'' کھڑکی سے رتی پوتے کی ہلکی آواز سنائی دی۔پھر اہل خانہ کی ملی جلی آوازیں آنے لگیں۔اُسی کا ذکر ہو رہا تھا۔نادر ہلکے سے مسکرا پڑا۔دل میں محبت کی لہرا اُٹھی۔''گاؤں کی فضا خراب سہی۔گھر کے اندر تو پیار ہی پیار ہے۔'' نادر جان نے سوچا۔''لگتا ہے میرے بنا یہ لوگ جی بھی نہ سکیں گے۔کتنی شدید ضرورت ہے ان کو میری۔'' اُس نے چوغا اور نیچا کر کے تسمے کو کمر سے باندھا ۔لباس درست کیا، اور اندر داخل ہو گیا۔

اس رات نادر کو نیند نہ آئی۔کروٹیں بدلتے بدلتے رات کا ایک پہر گزر گیا کمرے

کے اندر کا سکوت بہو، بچوں اور کونے میں بندھے ہوئے چند مویشیوں کی سانسوں سے مرتعش ہو رہا تھا۔ تھڑے پر بچھے پٹوؤں میں لپٹا محبوب جان بھی جاگ رہا تھا۔ کچھ ساعت کے بعد وہ ہلکے سے اٹھا۔ باپ کے سرہانے آیا۔ نادر جان اٹھا، دونوں نے آہستہ آہستہ سے پہناوے پہنے ہلکے سے کواڑ کھولے اور گرتی برف میں، رات کی خاموشی میں، چپکے چپکے ہر نگ کور کی بلندی کی جانب روانہ ہو گئے۔

"گھس شاس، گھس شاس، گھس شاس" نادر اور محبوب جان کے برف میں دھنستے پاؤں سے ہلکی آواز آ رہی تھی۔ سیاہی مائل فضا اور سفید زمین پر بغیر دینیوں کے چلنا مشکل نہ تھا۔ راستہ کی نشان دہی کے لئے مختلف جھاڑیوں اور درختوں پر محبوب نے سرخ کپڑے کے ٹکڑے باندھ رکھے تھے۔ وہ کہیں کہیں رُکتا۔ ٹہنیوں پر ہاتھ ڈال کر کچھ ٹٹولتا۔ جب سرخ رنگ کا بندھا کپڑے کا ٹکڑا مل جاتا تو وہ اپنی راہ متعین کر کے چل پڑتا۔ چند گھنٹے کی مسافت کے بعد برف سے اَٹی ہوئی فصیل جیسی بلند سفید چٹان سامنے دکھائی دی۔ اس چٹان کے متوازی دونوں نے چلنا شروع کر دیا۔ کبھی پاؤں برف میں پھنس جاتے تو دونوں اسی کا سہارا لیتے۔ ایڑی پر دباؤ ڈالتے، پاؤں کے پنجوں کو کھینچتے تاکہ پہناوے اتر نہ جائیں اور اس طرح قدم چھڑا کر اونچا کرتے اور پاؤں آگے رکھتے۔ گھس شاس" کی آواز آتی۔ پاؤں پھر دھنستے، پھر نکلتے اور اس طرح راستہ طے ہوتا گیا۔ چٹان ختم ہو گئی۔ نکڑ پر جھاڑیوں کو جھرمٹ تھا۔ یہ بھی برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ان کے بیچ چند ٹہنیاں کاٹ کر گذرنے کے بعد راستہ دشوار گذار نہ تھا۔ وہ جلد ہی ایک غار کے آگے جا رُکے۔ اُس کا دہانہ برف سے اَٹا پڑا تھا۔ اندر جانے کا راستہ جیسے مسدود ہو گیا ہو۔ محبوب جان نے کندھے پر سے کلہاڑی اتاری، برف پھرتی سے ہٹائی۔ برف پھسل کر نیچے ڈھیر ہو گئی۔ یہ ڈھیر

سیڑھی کا کام دے گیا۔دونوں اس پر پاؤں جماتے اوپر چڑھے اور غار کے اندر داخل ہو گئے۔اندر داخل ہوتے ہی محبوب جان نے دیئیوں کا کچھا اُٹھایا اُسے چقماق سے آگ دکھائی اور غار کے بیچوں بیچ ایک چولہا نما جگہ پر آراستہ لکڑیوں کے ڈھیر کو آگ لگائی ۔جب آگ بھڑک اُٹھی تو محبوب جان نے دیئیاں کھینچ نکالیں ۔انہیں بجھایا اور پھر سے کونے میں رکھ دیا۔

نادر جان خاموش غار کا جائزہ لے رہا تھا۔لگتا تھا اس کو قابل رہائش بنانے میں محبوب جان نے مہینوں صرف کئے ہیں ۔لاتعداد پھیرے لگائے ہیں۔کونے میں تھڑا بنا تھا ۔اس پر تازہ اور نرم پٹوؤں کا بستر آراستہ تھا۔فرش کو ہموار کیا گیا تھا۔اس پر جگہ بجگہ سوکھی گھاس بچھائی گئی تھی بیٹھنے کے لئے سوکھی گاس سے بھری پرانے پٹوؤں کی دو بڑی بڑی گدیاں آگ کے پاس زمین پر دھری تھیں ۔ایک طرف چھتی نصب تھی، اس پر ضروریات کی اشیاء اور چند برتن رکھے نظر آ رہے تھے ۔ایک طرف غار کی دیوار میں کھونٹا گڑا تھا۔اس پر دو مشکیزے ٹنگے تھے۔ان میں پنیر اور خشک پھل تھا۔ کونے میں کلہاڑا رکھا تھا۔دوسرے کونے میں لکڑیوں کا بڑا سا ڈھیر کاٹ چھانٹ کر تیار پڑا تھا۔انھیں کے پاس دیئیوں کا چھوٹا سا ذخیرہ تھا۔سونے کی جگہ،سرہانے کی طرف --ایک نفیس چمڑے کا چھوٹا مشکیزہ پڑا تھا۔اس میں انگوروں کی عمدہ شراب تھی ۔نادر جان نے ہر چیز کا بغور جائزہ لیا۔اس کا دل محبت سے بھر آیا۔اُس نے آگے بڑھ کر اپنے بیٹا۔اور اپنی ضد منوا کر اپنی جان کتنے خطرے میں ڈال رہے ہو۔ خیر چلو یہ بھی سہی۔"

محبوب جان نے بھرپور نظروں سے باپ کو دیکھا۔"اگر تم نے غار سے بھاگنے کی کبھی کوشش کی یا اپنے آپ کو راجہ کے حوالے کرنے کا کبھی سوچا بھی تو دیوتا کی قسم میں خود

تمہارے ساتھ ہی ہپر نگ کور سے کود جاؤں گا۔" محبوب جان کی نگاہوں سے التجا اور عزم دونوں جھلک رہے تھے۔

"نادر جان نے سر ہلایا جیسے سوچ رہا ہو، "مزید کچھ کہنا بیکار ہے۔ بات نبھانی ہی پڑے گی۔"

اُس نے سوٹی دیوار سے ٹکائی۔ پٹوؤں کو کندھے سے اتار کر غار کے دھانے کے قریب لے جا کر جھٹکا اور آگر کے سامنے پڑی گدی پر ڈال دیا پہناوے اتارے۔ اُن پر سے برف جھاڑی۔ شراب کا مشکیزہ کھولا۔ دو گھونٹ پیالے میں اُنڈیلے۔ خود پئے۔ تھوڑی محبوب جان کو پلائی اور کہا "اب تم جاؤ روشنی تیز ہونے سے پہلے تمہارا واپس پہنچ جانا ضروری ہے۔ اس سرما کے لئے میری ضرورت کی ہر چیز موجود ہے تم چند ماہ میرے پیچھے مت آنا۔"

محبوب جان نے پٹوؤں کو اپنے گرد لپیٹا اپنی کلہاڑی کندھے سے لگائی اور بولا "غار کے دہانے کے دائیں طرف درخت کی ایک موٹی شاخ برف میں پختہ گڑی ہے۔ اس شاخ کے نیچے گوشت کے چند بڑے ٹکڑے برف میں دفن یخ بستہ محفوظ رکھے ہیں۔ تمہاری وقتاً فوقتاً ضرورت کے لئے کافی ہوں گے۔"

دونوں نے اک دوسرے کو خیرباد کہا، بوسے لئے اور محبوب جان گھر کو روانہ ہو گیا۔ وہ جب گاؤں پہنچا تو روشنی تیز ہو چکی تھی۔ گھروں کی چمنیوں سے دھوئیں اُٹھ رہے تھے۔ اُس نے اپنے گھر کے کواڑ ہٹائے اور اندر داخل ہو گیا۔

اہل گور نے نادر جان کی گم شدگی کو اس کی موت سمجھ کر تسلیم کر لیا۔ "وہ خود ہی، قبل از وقت ہپر نگ کور سے جا کودا۔ اُس نے بصد اہتمام لے جایا جانا گوارا نہ کیا۔ نادر جان

ہم سب سے جدا تھا۔ اُس نے موت کو بھی اپنے ہی انداز سے گلے لگایا۔'' سب نے یہی اندازہ لگایا۔ محبوب جان کے گھر اظہار افسوس کے لئے سب آئے۔ گرتی برف میں بھی اس کے گھر ماتم گساروں کا تانتا بندھا رہا۔

دن گذرتے گئے۔ مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے رہے۔ نادر جان غار میں مقید زندگی گذارتا رہا۔ محبوب جان چھپ چھپ کر اس کی دیکھ بھال کرتا رہا اور اُس کی ضرورت کی اشیاء اُسے پہنچاتا رہا۔

غار کے اندر بیٹھے بیٹھے نادر جان اکتا گیا۔ برف باری ابھی ابھی بند ہوئی تھی۔ اُس نے سرد آگ کو ٹٹولا، کچھ چنگاریاں اُٹھیں، آگ بھڑکی، چند دیناں نیچے ڈال کر، درخت کو موٹا سا منڈا اوپر رکھ کر وہ پرے ہٹ گیا۔ آگ آہستہ آہستہ بھڑکنے لگی'' اب باقی کے دن کے لئے بھی یہی آگ کافی ہوگی۔ منڈ تو بہت دیر تک سلگتا رہتا ہے'' اُس نے سوچا۔

غار کے کونے میں رکھے ہوئے پہناوے پہنے۔ برچ کے درخت کی چھال سے بنی لمبی رسی لے کر انھیں باندھا۔ ٹوپی کو اپنے گرد لپیٹا اور غار کے دہانے پر جا کھڑا ہوا۔ باہر ہوا بند تھی۔ سورج سفید بادلوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ برف کی خاموش دنیا میں آج چندھیا دینے والی چمک نہ تھی نادر جان نے لحظہ بھر ماحول کا جائزہ لیا۔ پھر سوٹی تھامی اور باہر نکل کھڑا ہوا۔ اُس کا رُخ ہیرنگ کور کی جانب تھا۔

سوٹی سے راستہ ٹٹولتا، وہ آخر چوٹی تک پہنچ گیا۔ چوٹی ایک میز کی سطح کی طرح سپاٹ تھی۔ اُس کے کناروں پر ابھری ہوئی چٹانیں برف سے ڈھکی تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے چھوٹے سے میدان کی اونچی نیچی فصیل ہو۔ اسی فصیل سے ٹیک لگا کر نادر جان

بیٹھ گیا۔ کچھ دیر ستا کر وہ اُٹھا۔ اس نے دور افق تک پھیلے پہاڑوں کے وسیع سلسلوں کو دیکھا، ہمالیہ، قراقرم، ہندوکش،--ہندوکش کا بادشاہ ''دیعامر'' سامنے تنا کھڑا تھا۔ مگر آج اس پر قدرت جوش میں تھی چوٹی پر سے پھسلتا برف کا ایک دریا تیز رفتاری سے نیچے بہہ رہا تھا۔ نوکیلی چوٹی کی تیز نوک آہستہ آہستہ ٹوٹ کر اس دریا کی نذر ہو رہی تھی۔ دریا تندی سے رواں اپنے اندر برف کے بڑے بڑے تودے سمیٹتا، سنگلاخ چٹانوں کو کاٹتا، اپنی لپیٹ میں لیتا بہتا چلا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی برف کے یہ تودے ایک دوسرے سے ٹکراتے، کچھ لمحہ کے لئے ہوا میں اُڑتے، پھر دھپ سے نیچے بہتی مسلسل رواں برف کے دھارے میں کھو جاتے۔ ان میں سے نیلی چنگاریاں بلند ہوتیں سرخ شعلے لپکتے اور پھر ٹھنڈی برف میں گم ہو جاتے۔ بہتا ہوا یہ دریا دیعامر کی ناف تک پہنچا۔ بڑے بڑے سالہا سال پرانے درختوں کو اُن کی جڑوں سے اکھاڑتا، اپنی لپیٹ میں لیتا، ایسے جیسے ماچس کی تیلیاں ہوں، اور توڑتا گراتا، بہتا نیچے پستی میں جا کر، خشک و ویران تنگ سی وادی میں---جو سوکھی، بھربھری زمیں اور بڑے بڑے پتھروں سے اَٹی پڑی تھی۔---آہستہ ہوتا ہوا رینگنے لگا

''آج دیوتا دیعامر پر کیا غضب ڈھا رہا ہے۔ اُس کے جوش نے تو برف میں بھی آگ لگا دی۔'' نادجان نے سوچا۔

کچھ دیر بعد برف رینگتے رینگتے رُک گئی۔ دیعامر پھر ویسے پرسکون کھڑا اپنی عظمت نادرجان کیداد لینے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے چند ساعت قبل اس پر کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ وہ برف کا سیلاب، وہ ٹوٹتے گرتے درخت، وہ ٹکراتے، چنگاریاں اُڑاتے برف کے چھوٹے بڑے تودے، بس ساکت سے ہو گئے۔

نادرجان دم بخود اس نظارے کو دیکھتا رہا۔ اُس نے لمبی سانس بھری اور مڑ کر بیٹھنے کی

ٹھانی اُسے نیچے سے کسی کے اوپر آنے کی آہٹ سنائی دی "محبوب جان" اُس نے ہلکے سے آواز دی۔

"ہاں بابا" وہ محبوب ہی تھا۔ اُسے اپنے باپ کے معمول کا علم تھا۔ غار سے اکتا جاتا تو ہر نگ کور کی چوٹی کا ہی رخ کرتا۔ یہاں گور سے کوئی نہ آتا تھا۔ اس جگہ کو اچھا نہ سمجھا جاتا تھا۔ اہل گور صرف اپنے بزرگوں کو دھکیلنے یہاں آیا کرتے تھے۔

نادر جان کے لئے چہل قدمی کو اس سے محفوظ اور کوئی جگہ نہ تھی۔

محبوب جان نے کندھے سے ٹوکری اتاری۔ بھنا گوشت، تازہ دودھ اور تازہ پنیر کے ٹکڑے نکالے۔ روٹی رکھی، دودھ کو پیالے میں ڈال کر نادر جان کو پلایا۔

بھنا ہوا گوشت محبت سے کھلایا۔ پنیر اور خشک پھل دونوں نے مل کر کھایا۔ پھر دونوں باپ بیٹا ساتھ بیٹھ کر گھر اور گاؤں کی باتیں کرنے لگے۔ نادر جان اپنے پوتے اور پوتی کا ذکر سُن کر مسکراتا رہا۔ بکری کی بیماری کا سُن کر اُسے تشویش ہوئی۔ اس نے علاج تجویز کیا۔ گرما کی حاصل کی گئی شراب کو احتیاط سے رکھنے کے متعلق ہدایات دیں۔ بہو کی صحت کا پوچھا۔ اگلے سال کی فصل سے متعلق گفتگو کی۔ گاؤں کے آپس کے چند تنازعات کا سن کر محبوب جان کو مشورے دیئے۔ محبوب اپنے بابا کی باتوں کو بہت غور سے سنتا رہا۔

سورج سفید بادلوں کے پیچھے سفر کرتا مغرب تک پہنچ چکا تھا۔ فضا میں روشنی بجھنے لگی تھی۔ محبوب جان نے اپنے باپ کا ہاتھ پکڑا اُس کے پاؤں کے پہناؤں کی رسیاں درست کیں۔ سوٹی ہاتھ میں تھمائی، برتن سمیٹے اور دونوں باپ بیٹا غار کو روانہ ہو گئے۔
غار کے دہانے پر پہنچ کر نادر نے محبوب کو چوما اور کہا--- "میں تمہاری خوشی پوری

کررہا ہوں جان، زندگی کی خواہش تو کب کی ختم ہو چکی ہے۔"

"ایسے مت سوچو بابا ب، تمہاری موجودگی میں لئے بہت ضروری ہے۔ میں تمہاری رائے بغیر کسی مسئلے کو حل نہیں کرسکتا گور میں میری اہمیت تمہاری سانسوں کے ساتھ وابستہ ہے تم نہ رہے تو محبوب جان کی تنی پشت میں وہ بات نہ رہے گی۔ کیا بیٹے کا سہارا بننا زندگی کا مناسب جواز نہیں۔

محبوب کا جواب سن کر نادر مسکرا پڑا اور مڑ کر غار کے اندر چلا گیا۔

بیٹا باپ کی اوجھل ہوتی ہوئی پشت کو دیکھتا رہا۔ پھر چہرے پر اداسی کا تاثر لئے گور کو واپس ہولیا۔

وہ ایک گرما کی ٹھنڈی رات تھی۔ صاف آسمان پر چاند کھلا تھا۔ فضا منور تھی، سارا گور چمک رہا تھا۔ چاندنی میں نہائے درختوں اور پتھروں کے ساتھ بیٹھے ان کے سیاہ وجود ایک پراسرار تضاد پیدا کررہے تھے، آج راجہ کو نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ اپنے گھر کے دالان میں ٹہل رہا تھا، درخت سیبوں سے لدے تھے۔ فضا میں انکی مہک رچی تھی۔ راجہ کچھ سوچتا، ٹہلتا چلا جارہا تھا۔ آج اُس کی زندگی کے ایک سو سال پورے ہو چکے تھے۔ نوجوانوں کی بستی میں وہ اکیلا بوڑھا فرسودہ سوچوں کو ذہن سے لگائے حکومت کررہا تھا۔ تنہائی اُس سے جینے کی تمنا چھین رہی تھی۔ اُس نے اپنے جھریوں بھرے ہاتھ کو چہرے پر پھیرا اور دالان سے نکل کر پگڈنڈیوں پر ہولیا -- اس کا رخ ہیرنگ کور کی جانب تھا۔ اُس کے ہاتھ میں صرف ایک سوئی تھی۔ چاندنی اس کی راہ روشن کئے تھی۔ ساتھ میں کوئی حواری نہ تھا --- تنہا --- سوچ میں گم --- وہ اُس بلندی کی جانب روانہ تھا جہاں سے گذشتہ برسوں سے اُس کی رعایا میں سے

اُس کے ہم عمر نیچے دھکیلے جاتے رہے ۔رانی نے محل کی کھڑکی سے اُس کی جھکی گردن کو دیکھا ۔ٹھنڈی سانس بھری اور بستر پر دراز ہو گئی ۔اس کا دل اپنی بھولی فیروزاں کیلئے ویراں تھا ۔جو عنقریب ہپر ننگ کو رلے جائے جانے والی تھی ۔مگر وہ راجہ کو کچھ بھی نہ کہہ سکتی تھی ۔

راہ روشن تو تھی مگر راجہ کے آگے کا چند فٹ کا راستہ تاریک تھا ۔اُسے کبھی ٹھوکر لگتی اور کبھی نشیب میں پاؤں دھپ سے جا گرتا جس کے باعث اس کی ریڑھ کی ہڈی ہل سی جاتی ۔جھٹکا کافی سخت محسوس ہوتا ۔اُس کا اپنا سایہ بھی اُس کی راہ میں ٹھوکروں کا باعث بن رہا تھا ۔راجہ محتاط ہو گیا ،اور سوٹی سے ٹٹول کر چلنے لگا ۔

گھنٹوں گذر گئے ہپر ننگ کور کی چوٹی اب دور نہ تھی ،وہ بہت تھک چکا تھا ۔دم لینے کے لئے اُس نے مانوس راستہ چھوڑا اور دائیں طرف مڑتی ہوئی مبہم سی پگڈنڈی پکڑ لی ۔رُخ بدلنے سے اُس کا سایہ بھی ایک طرف ہو گیا ۔قدم ہمواری سے اُٹھنے لگے چٹان کے ساتھ ساتھ چلتی یہ بجری پگڈنڈی جھاڑیوں کے جھرمٹ میں گم ہو گئی ۔راجہ نے سوٹی سے جھاڑیاں ہٹائیں تو آگے آسان راستہ اور ایک چھوٹا سا ہموار میدان سا نظر آیا ۔راجہ اُسی میدان میں ستانے کے ارادے سے آگے بڑھا ۔وہ ایک چھوٹا سا کھیت تھا ۔چند ایک کیاریوں پر مشتمل جن کے بنے بند ھے تھے ۔بیچ میں سلیقے سے جڑی بوٹیاں لگی تھیں ۔"یہ قدرت کا نہیں کسی انسان کا کام ہے ۔مگر یہاں ویرانے میں ،چند بڑی بوٹیاں اگانے کون آسکتا ہے ۔"راجہ نے سوچا وہ گردو نواح کا جائزہ لینے لگا پھر اُسے دور اونے بڑے پتھروں کی اوٹ سے کسی کی آمد کا احساس ہوا ۔

"بے پناہ وسعتوں کا مالک انسان اپنے وجود کو اپنے ہی بنائے ہوئے قانونوں میں

مقید کر لیتا ہے۔ پھر اس قید کا اتنا قائل ہو جاتا ہے کہ اس کو اپنی زندگی کا انداز سمجھ کر، اپنی سوچ اور امنگ تک کو محدود کر لیتا ہے۔ دل سے ولولے اُٹھتے ہیں۔ ذہن سے خیالات اُبھرتے ہیں۔ ان کی گہرائی اور بلندی اسی احاطہ کی دیواروں سے ٹکرا کر اس محدود سے دالان میں گھومتی رہتی ہے جسے ہم لوگ زندگی کہتے ہیں۔ فطرت نے جن وسعتوں سے ہمیں نوازا ہے، جن بلندیوں سے ہماری آشنائی رہی ہے، جن گہرائیوں سے ہم اُبھرے ہیں۔ ہم اُن کی یاداشت تک رکھو بیٹھے ہیں۔ گور اور اُس کے قوانین سے علیحدہ رہ کر، تنہا جبکہ ہر دم ساتھی موت رہی، خود سے ہمکنار ہو کر میں نے کیا کچھ سمجھا۔ مگر صدیوں پرانی عادات کا پھندا ابھی توڑ نہیں سکا۔ میں چند میل نیچے جا کر اپنے گاؤں والوں کو کیا کچھ نہیں سمجھا سکتا۔ جرأت ہے کہ دل سے اُٹھتی ہے، ذہن سے ٹکراتی ہے۔ مگر ہاتھ پاؤں اس ارادے کی تائید میں متحرک نہیں ہو پاتے۔" نادر جان سوچ میں گم غار کے دہانے پر کھڑا تھا۔ اُس کے سامنے نشیب سے کسی کا سر اُبھرا اور بنے سے اونچا ہوتا ہوا ایک وجود کھیت میں آن کھڑا ہوا۔ چاندنی اس پہ چمکتی تو نادر جان نے دیکھا کہ سامنے راجہ کھڑا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں سوئی تھی۔ وہ کھیت میں اُگی جڑی بوٹیوں کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نیسر اٹھا کر گردا نوح پر نظر دوڑائی۔ نادر جان کا ہم عمر ہونے کے باوجود راجہ زیادہ بوڑھا دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر خستگی کے آثار تھے۔ نادر جان کو بالکل خوف محسوس نہ ہوا، نہ ہی اُس نے غار کے اندھیرے میں پناہ لینے کی کوشش کی۔ وہ آگے بڑھا۔ راجہ کے سامنے جا کر آہستہ سے جھکا اور اسے سلام کیا۔ راجہ چونک پڑا۔ نادر جان پر نظر پڑتے ہی چہرہ خوف سے زرد ہو گیا۔ سوئی ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ نادر جان نے لپک کر سہارا دیا۔

''میں بھوت نہیں ہوں۔خود نادر جان ہوں۔ابھی تک زندہ ہوں جیسے میرے متعلق مشہور ہو گیا تھا۔میں نہ ہپرنگ کورتک بھاگا،نہ ہی وہاں سے کود مرا۔میں یہاں آ گیا تھا۔برسوں سے یہاں غار میں تنہا زندگی گذار رہا ہوں۔بہت مدت کے بعد آپ کو دیکھا تو مارے خوشی کے رہ نہ سکا۔میرے ہم عمروں میں سے تو صرف آپ ہی زندہ رہ گئے ہیں۔باقی سارے ساتھی،یکے بعد دیگرے یہاں سے اوپر لے جائے گئے۔اور پھر کبھی نہ لوٹے۔یہ بھی اچھا ہے کہ آپ سلامت ہیں ورنہ میں تو سوچا کرتا تھا کہ اگر مجھے گوروا پس جا کر رہنا نصیب ہو بھی جائے تو اب وہاں میرا ساتھی کون ہوگا ۔''

راجہ خاموش نادر جان کو دیکھے جا رہا تھا۔اُس کے چہرے پر سکون تھا۔اُس کے الفاظ سے ٹپکتی محبت نے راجہ پر عجیب اثر کیا۔اُس نے اردگرد دیکھا اور نزدیک ہی پڑے پتھر پر بیٹھ گیا جیسے نڈھال ہو گیا ہو۔

''آپ کی صحت ٹھیک نہیں،رنگ مرجھا چکا ہے۔اعصاب کی کمزوری معدے پہ اثر انداز ہوتی ہے۔معدے کی خرابی سارے جسم کو کمزور کر دیتی ہے۔میرے پاس اس کے لئے موزوں دوا ہے۔اگر آپ اجازت دیں تو تیار کر کے محبوب جان کے ہاتھ روانہ کر دوں۔''

راجہ نے کچھ جواب نہ دیا۔اپنا سر جھکا لیا۔نادر پر سکون ہلکی مسکراہٹ لئے باادب کھڑا رہا۔

بہت دیر کے بعد راجہ نے سر اٹھایا۔نادر کو دیکھا،جی بھر کر دیکھا۔اور ایک بار پھر سر جھکا لیا۔اب کے جو سر اُٹھایا تو یوں لگتا تھا جیسے اس ایک گھڑی میں اُس کی عمر کے چند

سال اور گزر گئے ہوں۔

اس کا جسم ہلکے ہلکے لرز رہا تھا۔ایک طرف اپنی صریح حکم عدولی پر راجائی غصہ اور اس سے پیدا ہونے والی غضب کی لہریں اس کے وجود کو گھیرے تھے۔دوسری طرف اس کے دل میں نادر جان کو سینے سے لگا کر اسے "میرے ساتھی" کہنے کی امنگ بیدار ہو چکی تھی۔

راجہ بمشکل اُٹھا۔ بھیگے ہاتھوں سے اُس نے سوئی تھامی ۔ ماتھے کا پسینہ پونچھا لمبی سانس بھری، کندھوں کو ڈھیلا چھوڑا ۔قبا سیدھی کی اور مڑ کر گور کی طرف چل پڑا۔ اُس کے ذہن میں خیالات کا سلسلہ اپنا انداز بدل رہا تھا۔واپسی پر اُسے ٹھوکریں کم لگیں۔اُس کا سایہ پیچھے تھا۔چاندنی اُس کی آگے کی راہ منور کیے تھی۔وہ جلد ہی گھر پہنچ گیا۔

راجہ اور رانی دونوں رات بھر جاگتے رہے۔ایک ہی بستر پر دراز دونوں نے رات بسر کی۔اپنی اپنی دنیا کی سوچوں میں گم الگ تھلگ کروٹیں بدلتے رہے۔رانیفیر وزاں کے لئے متفکر رہی۔ راجہ نادر جان سے ملاقات کے بعد اُٹھنے والے خیالات کے ہجوم میں سرگرداں رہا۔

محبوب جان نے دروازے کے کواڑوں کو ہٹا کر ایک طرف دیوار کے ساتھ رکھا۔ کھڑکیوں کو کھول کر انکے در دیوار کے ساتھ کھڑے لکڑی کے کلّے سے باندھے دیئے اور مطمئن ہو کر گھر کے اکلوتے کمرے کا جائزہ لیا۔دھوپ اندر آرہی تھی۔اس کی بیوی فرش کو تازہ تازہ لیپ کر نیچے چشمے پر پٹو دھونے گئی ہوئی تھی ۔ بچے کھیتوں میں کھیل کود رہے تھے اور بکریوں کے لئے تازہ پتے اکٹھے کرنے میں لگے

تھے ۔محبوب جان نے چھت کے قریب دیوار سے نصب چھتی پر سے چمڑے کے دو ٹکڑے اُٹھائے ۔بکری کی خشک آنتوں سے بنے ڈورے کا گولا اُٹھایا ۔ایک برتن میں تھوڑا پانی لیا ۔ایک لکڑی کا چھوٹا ہتھوڑا اٹھایا اور صحن میں پڑے چوڑے پتھر کے پاس جا بیٹھا ۔اُس نے چمڑے کے ٹکڑوں کو پتھر پر پھیلایا ۔ان پر تھوڑا سا پانی چھڑکا اور لکڑی کے ہتھوڑے سے انھیں آہستہ آہستہ کوٹنے لگا ۔کچھ دیر کے بعد اس نے اپنا پٹوؤں میں لپٹا پاؤں آگے بڑھایا ۔چمڑے کے ٹکڑے پر رکھا ۔چمڑے کے اس ٹکڑے کو مخصوص انداز سے پاؤں کے گرد ذرا ڈھیلا چھوڑ کر لپیٹ دیا ۔ساتھ میں پڑے آنتوں سے بنے ڈورے کے گولے کو کھولا ۔اسے کس کر بہت سے پھیر دے کر ۔پاؤں کے اوپر لپٹے چمڑے کے ٹکڑے کو مہارت سے باندھ دیا ڈورے کے سرے پر مضبوط گرہیں لگائیں ۔پھر رُک کر پاؤں کا اچھی طرح جائزہ لیا ۔مطمئن ہو کر اُس نے اپنا ایک ہاتھ پاؤں کے پنجے پر رکھا ۔دوسرے ہاتھ سے ایڑی نیچے سے پکڑی اور پھر پاؤں کو دھیرے سے چمڑے کے اس خول سے نکال لے ا ۔اس کا ننگا پاؤں باہر آیا چمڑے کا یہ خول جس کے اندر پٹوؤں کی تہہ لگی ہوئی تھی سامنے پڑا برف پر چلنے کے انگریزی بوٹ سے مشابہ تھا ۔محبوب جان نے چمڑے کے دوسرے ٹکڑے سے اسی طرح کا ایک اور خول تیار کیا ۔پھر دونوں کو دیکھ کر سوچا ان سردیوں بابا کے پاس پاؤں کے لئے نئے اور گرم تر پہناوے ہوں گے اور رہبر تنگ کور کی چوٹی تک جاتے ہوئے اس کے پاؤں کو ٹھنڈ کم لگے گی''۔

اس کی بیوی چشمے سے واپس آئی ۔پہناووں کو دیکھا ۔معنی خیز نظروں سے شوہر کو دیکھ کر مسکرائی ۔محبوب جان بھی ہلکے سے مسکرایا ۔دونوں گھر کے اندر اور گاؤں کے گردو نواح میں نادرجان سے متعلق کبھی کوئی گفتگو نہ کرتے تھے ۔وہ خاموشی سے اندر گئی ۔

سبز پتوں میں لپٹے پنیر اور مٹی کے ایک کٹورے کو جس میں گوشت سے حاصل کی گئی لاٹ جمع تھی، اٹھا لائی "یہ بھی تیار ہے" وہ ہلکے سے بولی۔

"ابھی نہیں۔ ابھی انھیں چھت پر ہی رہنے دو اور یہ پہناوے بھی وہاں رکھ دو"۔ محبوب جان نے آہستہ سے جواب دیا۔

اس کی بیوی پہناووں کو اٹھا کر اندر لے گئی۔ محبوب اوزار سنبھالنے لگا۔ سامنے پگڈنڈی پر کوئی آ رہا تھا۔ راجہ کو حواری، جس کی زندگی کو بیشتر حصہ راجہ کی خوشامد اور اہل گور کو استعمال کر کے رجہ کی زندگی سہل تر بنانے میں صرف ہوتا تھا۔ اُس کی کسی کے گھر میں آمد راجہ کی طرف سے کوئی حکم لئے ہوتی تھی۔

"اور بیگار کیا مصیبت ہے۔ خدا خیر کرے۔ اب کے کتنے دنوں کا کام کرنا ہوگا" محبوب جان نے سوچا ناگواری کا تاثر چھپایا۔ آگے بڑھ کر خوش آمدید کہا۔

"محبوب جان تمہیں راجہ نے فوراً بلایا ہے"۔ حواری نے پیغام دیا۔

"کیوں خیر تو ہے؟" محبوب جان کے لہجے میں تشویش تھی۔

"بس چلے آؤ خود ہی معلوم کر لینا"۔ حواری نے مختصر سا جواب دیا۔

محبوب جان نے کندھے پر چادر رکھی۔ سر کی ٹوپی سیدھی کی۔ سوئی ہاتھ میں تھامی۔ بیوی کو مطلع کیا اور حواری کے پیچھے محل کی جانب روانہ ہو گیا۔

راجہ کے محل کے دالان میں اہل گور کی ایک مختصر سے بھیڑ تھی۔ ہر گھر سے ایک یا دو معتبر افراد کو بلایا گیا تھا۔ محبوب جان بھی جا کھڑا ہوا۔ اس اجتماع کی وجہ کسی کو بھی معلوم نہ تھی۔ سب ایک دوسرے سے پوچھ پاچھ کر خاموش ہو گئے اور صبر سے راجہ کا

انتظار کرنے لگے۔ محل کا دروازہ کھلا۔ راجہ اپنے متعدد بیٹوں کے ہمراہ باہر آیا۔ اور سامنے پڑی اکلوتی کرسی پہ جا بیٹھا۔ سب لوگ دست بستہ کھڑے تھے۔ ایک کے بعد ایک۔ سب آگے بڑھے۔ راجہ کا ہاتھ چوما۔ سلام کیا اور پھر اپنی جگہوں پر جا کھڑے ہو گئے۔ راجہ بغور اُن کے متجس چہرے دیکھتا رہا۔ ان میں نوجوان تھے۔ ادھیڑ عمر کے تھے۔ چند ایک بوڑھے بھی تھے۔ جن میں سے کچھ اسی برس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ سب کی کمریں سیدھی تھیں۔ چہرے پر صحت کی سرخی تھی۔ نظروں میں راجہ کے لئے اطاعت اور ادب کا تاثر تھا۔

اپنی مختصر سی رعایا کا جائزہ لینے کے بعد راجہ نے اپنا بوڑھا سر جھکا لیا۔ "ان کو ہم خود ہی ختم کر کے اپنی رعایا کی تعداد گھٹائے رہے۔، افراد کی تعداد تو راجاؤں کے لئے طاقت کا باعث ہوتی ہے۔ نوجوانوں کے بازو جہاں محنت اور طاقت کا جوش لئے ہوتے ہیں وہاں بوڑھوں کے دماغ عقلی تجاویز سے مزین ہوتے یں جو جوان بازوؤں کے مناسب استعمال کر طریقہ سوچ سکتے ہیں۔ میرے آباواجداد نے بن سوچے یہ حکم صادر کیا۔ اور پھر ہمارا یہ قانون ہی بن گیا۔ میں خود بھی اتنے برس تک اس پر عمل کرتا رہا۔ عقل بھی آئی تو اب جبکہ میں خود بوڑھا ہو چکا ہوں"۔ راجہ سر جھکائے سوچتا رہا۔ لوگ متذبذب منتظر کھڑے رہے۔

پھر اُس نے سر اُٹھایا۔ محبوب جان کو آگے بڑھنے کا حکم دیا اور کہا "تمہارے متعلق ایک عجیب اطلاع ملی ہے۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کیا وہ سچ ہے؟"

محبوب جان نے چونک کر چند ساعت کے لئے راجہ کو دیکھا راجہ کی آنکھوں میں شفقت تھی۔ ہونٹوں کے کونے خفیف مسکراہٹ کا انداز لئے تھی۔ محبوب جان کو اُس کے چہرے پر چڑھ اور رعب کا ملمع خوفزدہ نہ کر سکا۔ اُس نے اطمینان سے کہا"

فرمائیے میرے محترم"۔

"ہمیں علم ہوا کہ نادر جان زندہ ہے۔تم نے اُسے ہیر نگ کور پر ہی کہیں چھپا رکھا ہے ۔کیا یہ درست ہے؟"

محبوب جانتا تھا کہ وہ اپنے بابا کو ہمیشہ نہیں چھپا سکے گے۔کبھی نہ کبھی تو بات کھلے گی۔ پیشی ہوگی ۔گورکا راجائی دستور توڑنے والوں کی سزا سے وہ بخوبی واقف تھا۔اب جبکہ یہ لمحہ آچکا تھا۔اُس نے کچھ بھی خوف محسوس نہ کیا۔اُس نے اپنے اندر اطمینان او راعتماد کی لہریں اٹھتی محسوس کیں،اُس کے پیچھے کھڑے ہجوم میں جیسے کھلبلی سی مچ گئی۔ سب چونکے ۔سب نے سہم کر ایک دوسرے کو دیکھا اور ہراساں چہرے لئے کبھی راجہ اور کبھی محبوب جان کو دیکھنے لگے محبوب جانے سے سب کو رغبت،گاہے تجویز اور دعا کی صورت میں ۔اگر کوئی بہت لاچار ہو جاتا تو وہ سردیوں میں اپنے لیغ بستہ گوشت کا کچھ حصہ اپنی سوکھی گھاس اور جمع کردہ لکڑیوں میں سے کچھ نہ کچھ دے دیا کرتا تھا ۔آپس کے تنازعوں میں اس کو وجود ثالث کا سا ہوتا اور چھوٹے موٹے جھگڑے اہل گور آپس میں ہی طے کر لیتے۔راجہ تک پہنچنے کی نوبت کم ہی آتی۔محبوب جان کو وہ اپنے درمیان زندہ اور سلامت دیکھنا چاہتے تھے۔

"اب کیا ہوگا"سب کو تشویش تھی۔

راجہ نے ہجوم کے ردعمل کو وضاحت سے محسوس کیا۔محبوب جان کی مقبولیت سے وہ خوب واقف تھا۔راجہ کے اپنے مویشیوں کی صحت کا ذمہ اُس کی متعدد ذمہ داریوں میں سے ایک تھا جسے وہ بخوبی انجام دیا کرتا ۔راجہ خود بھی اُس کے متعلق ہمدردانہ جذبات رکھتا تھا اور آج تو اُس کے دل و دماغ کی کیفیت ہی کچھ اور تھی۔

محبوب جان کافی دیر خاموش رہا۔ راجہ کے چہرے کو بغور دیکھتا رہا۔ پھر رُک رُک کر۔ ایک ایک لفظ پہ ہلکا سا زور دے کر اُس نے چار لفظوں میں جواب دیا "درست ہے میرے محترم"۔

"تم نے ایسا کیوں کیا؟" راجہ نہ پوچھا۔

"میرا بابا، نادر جان، بہت عقلمند ہے۔ اُس کا زندہ رہنا اہل گور، میرے اور آپ کے لئے بہت ضروری ہے۔ اسی وجہ سے میں نے اس حکم کو نہ مانا اور اپنے باپ کو اب تک زندہ رکھا۔ پچھلے چند برسوں میں جتنے بھی علیل لوگوں کو میری دواؤں سے فائدہ پہنچا، جتنے بھی بیمار جانور، بچے اور اس طرح ہمارے پورے گلّے وبا سے محفوظ رہے، آپس کے تنازعات میں جو مناسب تجاویز میں نے دیں یہ سب میرے بابا کی عقل تھی جو میں استعمال کرتا رہا۔" یہ کہہ کر محبوب جان کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ پھر نرمی سے بولا۔ اس کی آواز میں ٹھہراؤ اور جرأت تھی۔ "آپ جو مناسب سمجھیں سزا دیں"

۔

راجہ نے بغور ہجوم کا جائزہ لیا۔ محبوب جان کو دیکھا اور کہا۔ "اگر تمہارا بابا اتنا ہی عقلمند ہے جتنا تم کہتے ہو تو اُسے میری طرف سے حکم دو کہ مجھے ریت کی رسی بنا دے"۔

یہ بات ناممکن تھی۔ سب جانتے تھے کہ نادر جان اور اُس کے بعد محبوب جان کا کیا انجام ہوگا۔ سب افسردہ گھروں کو لوٹ آئے۔

محبوب جان نے سیدھا ہر نگ کور کا رخ کیا۔ اُس کے اندر ایک اطمینان سا تھا۔ "میرا باپ اس مسئلے کو بھی کسی نہ کسی طرح حل کر لے گا۔ اُس کا دل کہہ رہا تھا۔

نادر جان نے غار کے دہانے سے یوں سوچ میں گم، کھلے بندوں، اپنے بیٹے کو آتے

دیکھا تو ٹھنڈی سانس بھری۔کل رات راجہ سے ملاقات کے بعد اُسے اُسی لمحہ کا انتظار تھا۔محبوب کے قریب پہنچتے ہی نادر جان نے پوچھا۔''کیا کہتا ہے راجہ''

''تو راجہ آپ کو مل چکا ہے؟؟''محبوب نے سوال کیا۔

''ہاں کل رات اِسی غار سے باہر ہماری ملاقات ہوئی تھی۔''نادر جان نے جواب دیا۔

''پھر تو مزید بہانہ بنانا فضول ہے''محبوب جان نے مایوسی سے سوچا اور بے دلی سے ایک کونے میں پڑے پتھر پر جا بیٹھا۔

باپ نے آگے بڑھ کر اُس کے کندھے پر دلاسے کی تھپکی دی۔سر کے بالوں کو محبت سے چھیڑا۔''بتا بیٹا جلدی بتا میں پیغام سننا چاہتا ہوں۔''نادر نے اصرار کیا۔

''راجہ کہتا ہے اگر آپ اتنے ہی عقلمند ہیں تو اسے ریت کی رسی بنا کر بھیج دیں۔''

نادر ہلکے سے ہنس پڑا بیٹے کے پاس جا بیٹھا۔پھر اُٹھا۔چھوٹے مشکیزے سے شراب نکالی۔تھوڑی بیٹے کو دی۔پیالہ صرف کر کے رکھا اور محبوب جان سے کہا۔''راجہ سے کہو مجھے اِس رسی کا ایک نمونہ بھیج دے۔اُسے دیکھ کر میں بخوبی ریت کی رسی بنا سکوں گا۔''

دوسرے دن اسی وقت،سب رجاہ کے محل کے احاطے میں اکٹھے ہوئے۔اُن کے چہرے پژمردہ تھے۔وہ اپنے دوست،اپنے ہمدرد کے انجام پر رنجیدہ تھے۔محبوب جان آیا تو اس کا اندازہ دیکھ کر انھیں چپ سی لگی گئی۔ہمدردی کی وہ سب تقاریر جو وہ تیار کرتے چلے آئے تھے اُن کے سینوں میں گم ہو گئیں۔وہ باادب،خاموش،ہٹ کر

ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ وہ صدیوں سے اس حکم کو مانتے چلے آئے تھے۔ وہ جو اپنے بزرگوں کو ہر رنگ کو رسے دھکیل کر راجاؤں کی اطاعت کا دم بھرتے رہے تھے۔ جن میں سے کسی میں بھی اپنے پیاروں کی جان بچا لینے کی جرأت پیدا نہ ہوئی تھی محبوب جان کے مطمئن چہرے سے آنکھ نہ ملا سکے اُس کے دلیری اُن میں احساس کمتری پیدا کر رہی تھی۔

سب نے محبوب جان کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ وہ تنہا، سب سے آگے، راجہ کا منتظر کھڑا تھا۔ راجہ اپنے بیٹوں کے ہمراہ آیا۔ اکلوتی کرسی پر جا بیٹھا۔ اُس نے سب لوگوں کا جائزہ لیا۔ لوگوں نے باری باری سلام کیا۔ وہ جب دست بوسی کے لئے آگے بڑھنے لگے تو راجہ نے اشارہ سے منع کر دیا۔ اور محبوب جان کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ محبوب جان نے آگے بڑھ کر راجہ کا ہاتھ چوما اور با ادب کھڑا ہو گیا۔

''جواب لائے ہو'' راجہ نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ میرے محترم۔'' محبوب جان نے جواب دیا۔

''کیا کہتا ہے نادر جان؟'' راجہ نے پوچھا۔

''میرا باپ کہتا ہے، آپ اُسے نمونہ بھیج دیں۔ اُسے دیکھ کر وہ بخوبی ریت کی رسی بنا لے گا۔''

راجہ جواب سُن کر کافی دیر خاموش رہا۔ پھر ہنس پڑا۔ لوگوں میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ محبوب جان لاتعلق راجہ کے چہرے کو دیکھتا رہا اور جواب کا منتظر رہا۔

راجہ نے کچھ نہ کہا۔ بس کرسی سے اُٹھا اور محل کے اندر چل دیا۔ اُس کے بیٹوں نے

اہل گورکو رخصت ہونے کی اجازت دے دی۔

باقی دن سے کے لئے تذبذب کا دن تھا۔کوئی نہ جانتا تھا کہ کیا ہوگا۔سب اپنی بے چینی چھپائے کاموں میں مصروف رہے۔سب محبوب اور نادر جان کے لئے دعا گو تھے۔محبوب جان نے گھر پہنچ کر کسی قسم کی تشویش کا اظہار نہ کیا۔اپنے وجود میں اطمینان کی طاقت لئے کام کاج میں مصروف رہا۔

دوسرے دن راجہ کے پیغامبر راجہ کی طرف سے ایک عظیم دعوت کا پیغام لئے ہر گھر پہنچے۔سب مردوں،عورتوں کو بلایا گیا۔سارا گور مدعو تھا۔ڈھولکوں،نوبتوں کی ''دف دف''پر جھومتے یہ پیغامبر ہر در پر دستک دیتے کھیتوں میں مصروف لوگوں کو آواز دے کر بلاتے۔درختوں پر چڑھے کمسن لڑکوں کو پکارتے۔دعوت کا پیغام دیتے اور سازوں کی لے پر چلتے دوسرے گھر روانہ ہو جاتے۔نوبتوں کی ''دف دف'' سے بکریاں چونک جاتیں۔بنوں پر اُگی جھاڑیوں کے سبز پتے چنتے چنتے کان کھڑے کرتیں۔پھر قلانچیں بھرتی بھاگ جاتیں۔گاؤں میں ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ دعوت کا پیغام انوکھا تھا۔

وہ اپنے صاف ترین لباس میں ملبوس ہو کر،اپنے عیال سمیت راجہ کے محل کے آگے بڑے دالان میں شام کا اندھیرے پھیلنے سے پہلے جمع ہو گئے۔

درختوں کے نیچے لکڑی کے کشادہ تختوں کو پتھروں پہ رکھ کر بڑے بڑے میز بنائے گئے تھے، یہ میز وادی میں پیدا ہونے والے ہر قسم کے خشک اور تازہ پھلوں سے آراستہ تھے۔، ہر میز کے وسط میں ایک مسلم بھنی ہوئی بھیڑ رکھی تھی۔اُبلے ہوئے چاولوں سے پُر مٹی کی بڑی بڑی طشتریاں تھیں۔پینے کے لئے انگوروں کی شراب

کے مشکیزے جا بجا سجے تھے۔ان کے ساتھ مٹی اور لکڑی کے کٹورے پڑے تھے۔ دالان کیا یک کونے میں سازندوں کی ٹولی شادیانے بجانے میں مصروف تھی۔راجہ انتہائی مسرور چہرہ لئے، اپنے بیٹوں کی ٹولی ساتھ لگائے اِدھر اُدھر گھوم رہا تھ الوگوں سے محبت آمیز خوشگوار گفتگو کر رہا تھا۔راجہ نے محبوب جان سے بھی خوش مزاجی کا برتاؤ کیا کیا کل کے جرگے سے متعلق کچھ بھی نہ کہا۔نادرجان کا ذکر تک نہ ہوا۔راجہ کے شفیق رویے سے اہل گور میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔لوگ کھانے پینے اور پلانے میں مصروف ہونگے۔جو متذبذب اور متفکر اس دعوت میں شریک ہوئے تھے۔اب اطمینان اور خوشی سے اس کے مزے لینے لگے محبوب جان خاموش رہا۔ اُس نے نہ تو زیادہ پی، نہ زیادہ کھایا۔وہ بغور راجہ کا جائزہ لے رہا تھا۔وہ اُس کے رویے سے کچھ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش میں محو تھا۔

جب شام رات میں ڈھل گئی۔ویٹیوں کے گچھوں سے تیار شدہ مشعلیں بھڑک اُٹھیں، لوگ سیر ہوگئے۔شراب کے مشکیزے قریباً ختم ہوگئے سازندوں کیساز خاموش ہونگے تو راجہ کرسی پر جا بیٹھا۔اُس کے بیٹے پیچھے قطار باندھ اکر باادب کھڑے ہوگئے۔اُس کے حواری اپنی مخصوص جگہوں پر متعین ہوگئے۔ہجوم پر خاموشی چھا گئی۔سوتے ہوؤں بچوں کو ماؤں نے اپنی گود میں لے لیا۔اور زمین پر بیٹھی رہیں۔مرد سب متوجہ کھڑے ہوگئے۔راجہ نے اپنے سامنے بکھرے لوگوں کو لحاظ بھر دیکھا اور کہنا شروع کیا۔"میں نے نادرجان کو معاف کیا۔محبوب جان کو بھی معاف کیا نادرجان کو باعزت واپس لایا جائے گا اور وہ اپنی باقی ماندہ زندگی ہمارے درمیان رہ کر گزارے گا۔"

یہ کہ کر راجہ رک گے ا۔اہل گور، خاموش دم سادھے کھڑے رہے۔وہ مزید کچھ سننے

کے منتظر تھے ۔راجہ نے پھر کہنا شروع کیا۔" آج کے بعد یہ دستور ہمیشہ کے لئے ختم ۔تمہارے بزرگ تا زندگی تمہارے ساتھ رہیں گے ۔اب ہپر نگ کور سے نیچے کوئی نہیں دھکیلا جائے گا۔"

راجہ کے خاموش ہوتے ہی ہجوم پر جیسے سناٹا چھا گیا لوگوں کے چہرے انتہائی سنجیدگی سے جیسے کھنچ سے گئے ۔شراب کا نشہ اُن کے وجود سے اُٹھنے والے جذبات کی نذر ہوگیا۔وہ کافی دیر خاموش کھڑے رہے ۔راجہ کی توقع کے برعکس کسی نے خوشی کا نعرہ نہ لگایا۔"عنایت" "مہربانی" "تشکر" کی صدائیں نہ بلند ہوئیں ۔اور نہ ہی آگے بڑھ کر راجہ کے ہاتھ چومے گئے ۔راجہ حیرت زدہ اِس سنگین خاموشی کو دیکھتا گیا۔تمام اہل گور سے جیسے ناپسندیدگی کی لہریں اُٹھ اُٹھ کر اُس کے اعصاب کو منتشر کئے دی رہے تھیں ۔وہ گھبرا سا گیا۔زیادہ دیر کرسی پر بیٹھا اُس کے لئے مشکل ہوگیا۔وہ اٹھا اور اپنے بیٹوں اور حواریوں کو لئے محل کے اندر چلا گیا۔

اہل گور نے اپنے بچوں کو سنبھالا ۔بزرگوں کو ساتھ لیا اور اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئے۔

اُن کے ذہنوں پر محبوب جان کی بغاوت، نادر جان کی جرأت اور راجہ کے فیصلے کا عجیب ردعمل ہوا۔وہ سوچنے لگے "اگر اس نہ گہانی حکم کو ختم کرنے کے لئے بس اتنی سی جرأت چاہیے تھی تو ہم میں سے کسی نے پہلے یہ جرأت کیوں نہ کی ۔اتنے برسوں سے ہم اپنے بزرگوں کو ہپر نگ کور سے نیچے دھکیلتے رہے اور یہ المیہ سہتے رہے ۔اگر یہ حکم اتنی آسانی سے بدلا جا سکتا تھا تو پھر اس راجہ اور اس سے قبل کے راجاؤں کو اس کا خیال کیوں نہ آیا۔ یہ راجہ لوگ کیسے جانور نما انسان ہیں ۔ان جانور نما انسانوں کی ساری طاقت ہماری اطاعت کے بل بوتے پر ہے ۔محبوب جان کی جرأت نے ان

کی دیوتائی اہمیت کا پردہ چاک کر دیا۔ اگر ہم سب مل کر جرأت کریں تو ان سے ہمیشہ کے لئے جان چھوٹ سکتی ہے۔ نہ یہ رہیں گے اور نہ ہی ان کے ناگہانی احکامات سہنے ہوں گے"۔

اس واقعہ کے بعد اہل گورکورویہ ہی بدل گیا۔ وہ راجہ کا کوئی کام نہ کرتے کوئی بھی بیگار پر راضی نہ ہوتا۔ راجہ کا کوئی حواری اگر کسی کو دھمکانے کی کوشش کرتا تو سب اس کی حفاظت کے لئے اکھٹے ہو جاتے اور اُس حواری کو ہر نگ کور سے نیچے دھکیلنے کی دھمکی دیتے۔ آہستہ آہستہ راجہ کے حواری بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ راجہ کے متعدد بیٹے خود اپنے کھیتوں میں کام کرتے۔ اپنے مویشوں کی دیکھ بھال کرتے۔ وہ اب اہل گور سے کچھ ڈرے سے رہتے تھے۔ انھوں نے راجہ کو پڑوسی راجاؤں سے مدد مانگنے کو کہا۔ ان سب کی آپس میں رشتہ داریاں تھیں۔ مگر راجہ نہ مانا۔ وہ جانتا تھا کہ رشتہ دار راجے حالات پر قابو پاتے ہی راج گدی کے خود مالک بن بیٹھیں گے اور وہ اپنی موجودہ حیثیت بھی کھو بیٹھے گا۔

پھر حالات اتنے دگرگوں ہو گئے کہ راجہ نے اپنی اولاد کو پڑوسی ریاستوں میں جہاں ان کے رشتے ہو چکے تھے، شادی کر کے وہاں کے راجاؤں کی زیر نگرانی بھیج دیا۔ عزیز و اقارب کا بھی کچھ ایسا ہی بندوبست کیا اور خود اپنے محل میں تنہا مقید س ہو کر موت کے انتظار میں زندگی کے باقی دن گذارنے لگا۔

اس واقعہ کے صدیوں بعد ۱۸۶۶ء میں ایک ETHNOCOLOGIST جس کا نام تھا ROGTTLIEB WILHELM LEITNER اور جس کی ڈگریاں تھیں M.A, PH.D, LL.D, D.O.L, گور پہنچا۔ ڈاکٹر لیٹنر غالباً بیس زبانیں بول سکتے تھے چیلاسی زبان سمجھتے تھے۔ اس علاقے کے قبائل کی نسل،

رسم و رواج، اور تاریخ سے متعلق چھان بین کرنے آئے تھے۔ وہ یہاں کچھ عرصہ مقیم رہے۔ انھیں یہ جان کر بہت تعجب ہوا کہ ان دور دراز پہاڑوں کے مابین یہ پس ماندہ علاقہ جو باہر کی مہذب اور تعلیم یافتہ دنیا سے الگ تھلگ ہے، سیاسی طور پر کتنا ترقی یافتہ ہے۔ یہاں کا طرز حکومت جمہوری ہے۔ ''گور'' میں باقاعدہ انتخابات ہوتے ہیں۔ چند افراد پر مشتمل ایک گروہ کو کچھ مدت کے لئے منتخب کیا جاتا ہے۔ اس میں عورتیں بھی منتخب ہو سکتی ہیں۔ اور وہ گروہ علاقائی نظم و نسق کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ یہ جمہوری طرز حکومت وادی چیلاس کے تمام گاؤں میں رائج تھا۔

ڈالیٹر کا کہنا ہے کہ وادی چیلاس کے ان چھوٹے چھوٹے گاؤں کو ۱۸۶۶ء میں جو سیاسی حقوق حاصل تھے۔ وہ تمام ہندوستان کے لندن میں مرکزی دفتر کو برطانوی راج میں نصیب نہ تھے۔

پرڑی کی محبت

سالہا سال قبل ''ناران'' ایک خاموش وادی تھی۔ سطح سمندر سے تقریباً آٹھ ہزار فٹ بلند اس گاؤں میں کوئی نہ رہتا تھا وادی کہنار کے بیچوں بیچ واقع، تنہا، قدرت کے حسن کو سمیٹے، گھنے جنگلوں میں چھپا، شیر، ریچھ، اور ''پرڑی'' جیسے جانوروں کا مسکن بنا، یہ انسان کا منتظر تھا۔

یہاں کی فضائیں دریائے کہنار کے شور، چیڑ کے گھنے درختوں کی سبز اور سوکھی ''تر'' کی ''شان شان'' سردیوں کے، جوشیلے طوفان، نالے کی ہنگامہ خیزی اور گرما کی تیز دھوپ میں چٹانوں اور پتھروں کی چیخ سے گونجا کرتیں۔

پھر ایک دن انسان نے اسے ڈھونڈ لیا --- انسان جو ازل سے نئے آستانوں اور مزید خوراک کی تلاش میں رہا ہے، یہاں بھی آن پہنچا۔

کشمیر کے چند لوگ نیلم وادی میں آئے۔ ''شاردا پہنچے۔ پھر انہوں نے سیف الملوک کے پہاڑوں کا رُخ کیا۔ ان میں بجرے راستوں کو ناپتے اونچائیاں سر کرتے، ریچھوں سے بچتے بچاتے، غاروں میں دم لیتے۔ جھیل سیف الملوک تک پہنچے۔ یہاں انہوں نے پہلا پڑاؤ ڈالا۔ ستائے، جگہ کا جائزہ لیا۔

سیف الملوک کے علاقے میں گھاس تھی۔ میٹھا پانی فراواں تھا۔ پتھر بھی تھے مگر خنکی زیادہ تھی اور درخت ناپید تھے۔ وہ آگے بڑھے۔ چند سو فٹ نیچے جا کر درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا راہ کے ساتھ، ساتھ پانی کا نالہ رواں تھا۔ آب و ہوا کی تر خنکی اور زمین کی مٹی کے ڈھنگ اچھی فصل کا پیغام لیے ہوئے تھے۔ چشموں کی بہتات تھی۔

وہ متجس بڑھتے چلے آئے اور ناران آن پہنچے۔

ہوسکتا ہے کہ اس گروہ سرغنہ نارائن ہو جس کی مناسبت سے یہاں کا نام ''نارائن'' سے ''ناران'' بنا اور اس صورت میں ہم تک پہنچا۔ ''یونس شکاری'' کا یہی خیال ہے۔ ممکن ہے کہ درست ہی ہو۔

ان لوگوں نے زمین کو پھاوڑوں سے ہموار کیا، پتھر ہٹا کر گھر بنائے۔ درختوں کو کاٹ چھانٹ کر در لگائے۔ کھیت بنائے۔ فصلیں بوئیں اپنے جانوروں کی حفاظت کے لیے لکڑی اور کانٹوں کی بلند باڑھیں بنائیں۔ حفاظتی کتوں کو چھوڑا اور اس طرح یہاں بسیرا کر لیا۔

سردیاں آنے پہ وہ کشمیر واپس ہو لیے۔ گرما میں آتے۔ سرما میں لوٹ جاتے۔ یوں کشمیر سے اس ٹولے کا ناران میں آنا جانا شروع ہو گیا۔ کھیتوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ باڑیں اور جنگلے پھیلتے گئے۔ گھروں کی تعداد بڑھتی گئی۔ جنگل کٹ کٹ کر بالن کے ذخائر میں اضافہ ہو گیا۔

ان لوگوں میں مختلف ذاتوں اور قبیلوں کے افراد تھے۔ یونس شکاری کا کہنا ہے کہ بائیس ذاتیں ناران اور وادی کہنار کے دیگر گاؤں میں آئیں۔ انہیں آباد کیا۔ قابل رہائش بنایا۔ کچھ عرصہ تک تو صرف گرما کے لیے استعمال کیا مگر پھر یہاں کی ہو کر رہ گئیں۔ ان میں ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔

''یونس شکاری'' نارانکی ان لکھی تاریخ ہے وہ یہاں کے معاشی اور سماجی مسائل کا ایک جریدہ ہے۔ وادی کے دو بہترین شکاریوں میں سے ایک ہے۔ سیاسی شعور، طرار دماغ، زندہ سوچ رکھنے والا یہ ان پڑھ نارانی بوڑھا ایک دلچسپ شخصیت ہے

جی چاہتا ہے اس کا ایک علیحدہ سے خاکہ لکھ ڈالوں ۔ میں نے اس سے ایک دن پوچھا ''پرڑی'' کیا ہے''؟

اس نے بتایا کہ پرڑی ایک عورت نما شیرنی ہے ۔اس کا چہرہ عورت کا ہے لانبے لانبے بال ہیں آنکھوں میں بلا کی کشش ہوتی ہے ۔نظر سے نظر مل جائے تو مرد مسحور ہو جاتے ہیں ۔اس کے حسین چہرے پر نظریں جمائے کھنچ کر اس کے قریب جا پہنچتے ہیں ۔''پرڑی'' انہیں اٹھا لیتی ہے ۔گھنے جنگلوں میں، چھپے غاروں میں لے جاتی ہے ۔انہیں اپنا قیدی بنا کر رکھتی ہے ۔اُن سے محبت کرتی ہے ۔انہیں خوراک مہیا کرتی ہیں ۔اور سارہ وقت ان کے پاؤں چاٹتی رہتی ہے اور اتنا چاٹتی ہے کہ ان کے پاؤں آہستہ آہستہ پتلے ہونے شروع ہو جاتے ہیں ۔پھر وہ پاؤں بیکار ہو جاتے ہیں ۔وہ چاہیں بھی تو غار سے نہیں نکل سکتے ۔''پرڑی'' کی محبت کے جبری اسیر یہ مرد سسک سسک کر دم توڑ دیتے ہیں ۔پرڑی کچھ عرصہ تک ان کی موت کا باقاعدہ رنج کرتی ہے اور پھر دوسرے مرد کے شکار کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی ہے ۔

میں نے جھرجھری لی ۔

''کیا تم نے کبھی پرڑی کو دیکھا ہے؟'' میں نے پوچھا ۔

''میں نے تو نہیں، میرے پھوپھا نے اس ایک بار دیکھا تھا'' وہ بولا

''کہاں'' کیسے؟؟'' میں پوچھا ۔

''پندرہ یا بیس سال پہلے کی بات ہے جی ۔یہ جنگل بہت گھنا تھا ۔اتنا گھنا کہ سورج کی روشنی بھی اندر نہ آسکتی تھی دن دھاڑے شام کا سا سمان رہتا تھا لوگ اکیلے جنگل میں لکڑیاں کاٹنے کم ہی جاتے تھے ۔میرے پھوپھا کو کسی وجہ سے دیر ہوگئی ۔وہ تنہا واپس

آ رہا تھا اسے ایک عورت نما مخلوق دکھائی دی دور سے ایسے لگتا تھا گویا چادر میں لپٹی کوئی مظلوم رو رہی ہے اور مدد کے لیے پکار رہی ہے۔ میرا پھوپھا رک گیا اس کا جی چاہا قریب جائے اور پوچھے کہ ماجرا کیا ہے۔ ہو سکا تو مدد کرے اسنے قدم بڑھائے۔ فاصلہ کم ہوتے ہی چادر میں چھپا چہرہ ذرا نظر آتا تو دماغ جیسے جھٹکے سے جاگ اٹھا۔ ''بھاگ بیوقوف بھاگ۔ جان بچا اپنی۔ یہ پرڑی ہے'' اسکے ذہن نے خبردار کیا۔ پھوپھا نے جس لگائی۔ پگڈنڈی پہ پگڈنڈی پھلانگتا چلا گیا ایسی سرعت سے جیسے موت اسکے پیچھے لگی ہو۔ وہ موت ہی تو تھی۔ ''پرڑی'' غضب ناک ہو اٹھی۔ اس کی آوازیں بلند ہوتی گئیں۔ وہ اس کے پیچھے بھاگتی چلی آئی۔ مگر پھوپھا کی رفتار تیز تھی۔ جب گاؤں نزدیک آیا تو وہ رک گئی۔ اس نے جھنجھلاہٹ میں پھوپھا پر بے تحاشا، پتھر پھینکے۔ مگر وہ اِدھر اُدھر ہی گرتے رہے۔ پھوپھا کو کوئی گزند نہ پہنچا۔ وہ مردوں کو زخمی کرنے سے گیز کرتی ہے انہیں زندہ پکڑنا چاہتی ہے۔ گھر پہنچتے ہی پھوپھا کو شدت کا بخار چڑھا۔ وہ ہفتہ دس دن بخار میں پھنکتا رہا۔ پھر وہ خود بخود ٹھیک ہو گیا۔ مدت تک اس نے جنگل کا رخ نہ کیا۔ وہ خوف زدہ سا ہو گیا تھا۔''

''کیسی تھی وہ؟ کیا تمہارے پھوپھا نے ''پرڑی'' کی شکل غور سے دیکھی تھی؟؟'' میں پوچھا۔

''اس نے شکل غور سے نہ دکھی۔ اس کی آنکھوں میں کہیں جھانک لیتا تو اسی کا ہو کر رہ جاتا۔ مگر یہاں کافی سال پہلے۔ ناران کے دس پندرہ لوگوں نے اسے دیکھا تھا۔''

''وہ کیسے؟؟؟'' میں نے پوچھا۔

''یخ بستہ سردی تھی ناران کا گاؤں برف سے ڈھکا تھا۔ جانور بھی اپنے مختصر اصطبلوں

میں کھڑے، ایک دوسرے سے جڑے، فضا کو گرما کر سردی گذرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ گھروں کے اندر آگ سارا وقت روشن رہتی تھی۔ کہتے ہیں کہ پرڑی آئی۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا اور گڑگڑا کر، سردی سے بچنے کے لے اندر آنے کی اجازت چاہی

۔

''مجھے ذرا آگ سینک لینے دو'' وہ گویا ملتجی تھی۔

گھر والوں نے دروازہ نہ کھولا۔ اس کی التجائیں مسلسل جاری رہیں۔ دست ہوتی رہی۔ کتوں کے بھونکنے کے باوجود ''پرڑی'' نے جانے کا نام نہ لیا۔ تب دس پندرہ مردوں نے اسے قابو کرنے کی ٹھانی۔ وہ سوٹیوں، کلہاڑیوں سے لیس باہر نکلے'' پرڑی'' کو پکڑنا چاہا مگر اس کے بھورے بال چکنے تھے۔ وہ کتنا ہی طاقتور ہاتھ کیوں نہ ڈالتے، پرڑی اپنا بازو آسانی سے چھڑا سکتی تھی۔ سب نے ہی اسے سیکھا۔ کندھوں سے لے کر پاؤں تک لانبے لانبے بھورے بالوں میں ڈھکا جسم، عورت کا چہرہ، خدوخال انسانی رنگ کھلتا ہوا اور جاذب آنکھیں سیاہ مگر ان کی بناوٹ مختلف تھی۔ یوں ''ا'' ''الف'' کی طرح تنی ہوئی بھنوؤں کے قریب سے شروع ہو کر رخساروں کی ہڈیوں کے اوپر حلقوں پر جا کر ختم ہوتی تھے ں۔ ان انوکھی آنکھوں میں بلا کی کشش تھی۔ مگر نارائی مرد جانتے تھے۔ انہوں نے پرڑی کی نظر سے نظر نہ ملائی۔ بس پکڑ کر اسے قابو کرنا چاہا۔ مگر وہ اتنی چکنی تھی کہ پھسل پھسل کر ان کی گرفت سے نکل جاتی تھی۔ آخر وہ بھاگ گئی۔ تیز سی نالوں اور چٹانوں کو پھلانگتی برفیلی گھاٹیوں کو عبور کرتی، اوپر گھنے جنگلوں میں گم ہوگئی۔ اب اس تک پہنچنا نارواں والوں کے بس میں نہ تھا۔''

پرڑی کی کہانی سن کر میں نے گھبرائی سے نگاہ اٹھائی اور سامنے کھڑے بلند پہاڑ کو

دیکھا اس پر جنگل تو نہیں البتہ چیڑ کے درختوں کے مختصر جھنڈ تھے کہیں کہیں سے پہاڑ بالکل ننگا تھا اسکی خالی ڈھلوانوں پر مٹی اور پتھروں کی پھسلتی راہداریوں پر چند جنگلی بوٹیاں اور اکا دُکا درخت کھڑے تھے۔

یونس نے میرے تیور بھانپ لیے اور ہنس کر بولا۔ ''اب تو جی جنگل ختم ہوا جا رہا ہے۔ پچھلے سالہا سال کی چوریوں سے گنجے پہاڑ ہی رہ گئے ہیں۔ ہم لوگوں کو بالن اکٹھا کرنے کیلئے دور اوپر ''طلاق پڑی'' تک جانا پڑتا ہے۔ پڑی غریب بھی بھاگ کر کہیں اور جا بسی ہوگی''۔

میں گذشتہ چودہ برس سے ناران کو دیکھتی چلی آئی ہوں۔ بہت ہی خوبصورت گاؤں ہے۔ شروع کی بلند پہاڑی پر کھڑے ہو کر نیچے نگاہ دوڑاؤ تو ایک مسحور کن نظارہ ہے۔ محدودسی، بے درخت وادی ہے۔ اس کی زیادہ تر زمیں آلوؤں کے کھیتوں اور چراہ گاہ کے سرسبز قطعوں سے مزین ہے بائیں طرف کے سبز چراہ گاہ کے قطعے بتدریج سبز پہاڑیوں میں بلند ہوتے ہوئے ایک اُونچے پہاڑ سے جا ملتے ہیں۔ اس پہاڑ پر جگہ جگہ چیڑ کے درختوں کے جھنڈ ہیں۔ اسی کے بیچوں بیچ، ذرا آگے کو نکلا ہوا، ایس پہاڑ کا ایک حصہ چیڑ کے انہی نوعمر درختوں سے پُر ہے۔ یہ جوان جنگل گھان ہے اور چوٹی تک پھیلا ہوا ہے۔ گاؤں کے عین درمیان کچی سڑک ہے۔ جس کے دونوں طرف پتھروں اور لکڑی کی بنی ہوئی بوسیدہ دوکانیں ہیں۔ ان میں گڑ، دیسی صابن اور چائے سے لے کر شیمپو، کافی اور ٹن جوس تک کی سی اشیاء مل جاتی ہیں۔ ان دوکانوں کی قطار کے پیچھے بائیں طرف پوشور بہتا ہوا دریائے کہنار ہے۔ جھاگ اگلتا یہ دریا پہاڑی سے سفید سانپ کی طرح بل کھاتا نظر آتا ہے۔ اس دریا کے دوسرے کنارے پر ایک اور پہاڑ ہے۔ اس کی ڈھلوانیں زیادہ ترچھی ہیں یہ پہاڑ بالکل ننگا

ہے پس چوٹی کے پاس چٹیل سلیٹی چٹانوں کے اوپر چیڑ کے درختوں کا گھنا جھنڈ ہے اسی جگہ کو" طاق پڑی" کہتے ہیں۔

گاؤں کی فضا دریا کے شور سے سارا وقت گونجتی رہتی ہے بازار میں دوکانوں کے آگے دونوں اطراف شفاف پانی کی تیز بہتی ہوئی کھلی نالیاں ہیں دوکاندار اپنی روز مرہ کی ضروریات انہیں نالیوں سے پوری کر لیتے ہیں۔یہاں کمیٹی کے نل نہیں ہیں۔

بازار ختم ہوتے ہی سیف الملوک جھیل سے آتا ہوا بلّور جیسے شفاف پانی کا طوفانی نالہ ہے۔اس کا شور تو اس قدر ہے کہ قریب سے گزرتے ہوئے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اس پر بنے ہوئے لکڑی کے کچے پل کو پار کرو تو وادی کا حسن اور نکھر جاتا ہے۔سڑک دائیں طرف پہاڑ کے ساتھ لگی لگی، آگے رواں رہتی ہے۔بائیں طرف کی ہموار زمین وادی میں سب سے زیادہ مفید اور قیمتی ہے۔

یہ حکومت کی ملکیت ہے اس پر اخروٹ کا چھدرا جنگل ہے۔جا بجا پتھریلی راھداریاں ہیں۔جن پر سے جیپ اور کار دونوں گذر سکتے ہیں یہاں حکومت نے خوبصورت ترین مقامات پر اپنے افسروں کے لیے آرام گھر بنا رکھے ہیں۔پہلی بار ہم انہیں میں سے ایک آرام گھر میں ٹھہرے۔

مجھے یہ جگہ بہت پسند آئی۔بہت سے پلاٹ خالی تھے۔اس جگہ کو فروغ دینے کے لیے حکومت کا منصوبہ تھا کہ انہیں نجی گھروں کے لیے سستے داموں نیلام کر دیا جائے

۔

دوسرے سرے پر اخروٹ کا چھدرا جنگل دریا سے جا ملتا ہے۔یہاں کہیں چھوٹے بڑے پتھروں والا اور کہیں نرم ریت والا پُرسکون ساحل ہے جس کے ساتھ لگا دریا

اپنی رفتار بتدریج آہستہ کرتا، پرلے کنارے کے پہاڑ سے ملتا بچھڑتا، بہتا چلا جاتا ہے۔

ناران کے آخری کونے پر وادی تنگ تر ہو جاتی ہے۔ یہاں دریا بل کھا کر آگے ذرا کشادہ وادی میں جا نکلتا ہے،۔ اس جگہ ترچھی ڈھلوانوں پر اٹکا ہوا چند گھروں پر مشتمل، ایک گاؤں ہے، جس کا نام ہے ''دم دما''

''دم دما'' کے موڑ پر چند سال پہلے کافی مچھلی ہوتی تھی۔ چند گھنٹے کے شکار کے بعد دس بارہ مچھلیاں ہمیشہ مل جاتی تھیں۔ ہم آرام گھر سے چل کر میل بھر فاصلہ طے کر کے یہاں آیا کرتے تھے۔ میرے بیٹے اور شوہر شکار میں مصروف رہتے۔ مجھے کبھی موقع مل جاتا تو مقامی لوگوں سے گفتگو کر کے انہیں سمجھنے کی کوشش کرتی۔ دوپہر کا کھانا ہم ساحل پر ہی درختوں کی چھاؤں میں کھاتے اور کبھی سرسراتی ہوا کے جھونکوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے، وہیں، دوپہر بھر کو سو بھی جایا کرتے۔

مجھے یاد ہے ۔۔۔ وہ عام لڑکوں سے نسبتاً زیادہ چُست تھا۔ اس کی چمکدار آنکھوں میں خوداعتمادی کی جھلک تھی۔ وہ ہمیں دیکھ کر ہی ''دم دما'' سے آیا تھا۔

اس کی عمر دس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ کسی سکول میں نہ جاتا تھا۔ اپنی کھیتی باڑی کرتا تھا اور زیادہ تر باپ کے ساتھ ہی رہتا تھا۔

''آپ کہاں سے آئے ہیں؟ شہر کیسا ہوتا ہے؟ لاہور کیا بہت دور ہے؟ وہاں جیپ جاتی ہے؟ کاغان سے تو بس بھی جاتی ہوگی؟ بس کا کرایہ کتنا ہوگا؟ اتنے پیسے کتنے ہوتے ہیں؟ آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟ میرا گاؤں خوبصورت ہے یا آپ کا؟''
اس نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

اس کا تجسس مجھ میں اس کے لیے دلچسپی پیدا کر رہا تھا ۔ میں اس کے ہر سوال کا جواب اس کی ذہنی سطح کے مطابق تفصیل سے دیتی جاتی تھی ۔ مجھے اس سے اسی کے ملک کے متعلق بتاتے ہوئے بہت اچھا لگ رہا تھا ۔ اس نے نقد روپیہ بہت کم دیکھا تھا ۔ یہاں اس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہ تھی ۔ کپڑے وہ سال میں ایک آدھ بار نا ران بازار سے بکری یا آلوؤں کی فصل کے بدلے جا کر خرید لاتے تھے ۔ بکریوں کے بالوں سے اُون حاصل کر کے اسکی ماں، سردیوں میں بہت اچھے پٹو بُنتی تھی ۔ ان سے وہ لوگ بہت گرم رہتے تھے ۔

''آج کل تو بہت گرمی ہے ۔ قمیص میں بھی بمشکل گزارا ہوتا ہے''اس نے اپنی ملیشیا کی قمیض کے دامن کو ہاتھ میں اٹھا کر پنکھے کی طرح جھلتے ہوئے کہا ۔ وہ اس ایک گھنٹے میں کافی بے تکلف ہو چکا تھا ۔

''یہ آپ نے کیا پہنا ہے؟''اس نے میری ولائتی ''کیشمر ''

سوئیٹر کو ہاتھ لگاتے ہوئے پوچھا

''سوئیٹر'' یہ بھی بھیڑ کی اون سے بھی ہے''میں نے جواب دیا ۔

''نہ کرو نہ جی'' وہ حیرت سے اوچھل پڑا ۔

''یہ تو جی بہت ملائم ہے ۔ یہ رنگ اون پہ کیسے چڑھا؟؟ یہ تو جی ریشمی لگتی ہے!!!'' وہ آنکھیں پھاڑے دونوں ملگجے ہاتھ میری سوئیٹر کے بازو پر مل رہا تھا ۔

''تم آرام گھر میں آنا کل صبح میں تمہیں ایسے ہی رنگ والی، ملائم سوئیٹر دوں گی ۔''میں نے اپنی خفت چھپاتے ہوئے کہا ۔

دوسرے دن وہ شرماتا، شرماتا آیا، اس میں خود اعتمادی کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ میں آرام گھر کے خوشنما پردوں اور خوبصورت قالین والے کمرے میں اسے بالکل اجنبی سے لگی رہی تھی۔ دریا کے ساحل پر قائم کی گئی دوستی جیسے وہیں رہ گئی ہو۔ سویٹر دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا۔ کچھ دیر کے لیے وہ گردونواح کو بھول سا گیا۔ سویٹر کا فیروزی رنگ اسے بہت پسند آیا۔ وہ کچھ دیر تو اس پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ ''بھیڑ کی اون ہے جی؟ کمال ہے'' وہ بے اختیار کہہ اُٹھا پھر اس نے ٹوپی اتار کر صوفے پر رکھی اور جھٹ سویٹر پہن لی۔

واپسی پر وہ خوش، خوش ہلکے ہلکے قدموں سے جا رہا تھا۔ اس گرمی میں بھی وہ سویٹر اسے مزا دے رہی تھی۔

ناشتے کے بعد ہم لوگ آرام گھر میں کم ہی ٹھہرتے۔ روزانہ کہیں نہ کہیں نکل جاتے۔ میرے شوہر اور بیٹے ہر روز کوئی نئی جگہ چنتے، اور وہاں جا کر مچھلی کے شکار میں مصروف ہو جاتے۔ میں اکثر ان کا کھانا لے کر ایک دو گھنٹہ بعد جایا کرتی۔ ساتھ آرام گھر کے چوکیدار کے لے لیا کرتی اس دن بھی یہی طے پایا کہ شکار ''دم دما'' کے موڑ پر کیا جائے۔ میں وہیں جا رہی تھی۔ پل پار کر کے دریائے کہنار کے اس پار باریک سی پگ ڈنڈی تھی جو پہاڑ کی ترچھی ڈھلوان پر کچھ اس طرح اٹکی تھی کہ کئی جگہوں پر بمشکل پاؤں پورا آتا ایڑیوں سے ٹکرا کر کنکر پھسلتے اور لڑھکتے چند فٹ نیچے دریا میں جا گرتے۔ ذرا آگے جا کر یہی پگ ڈنڈی اچھی خاصی چوڑی راہداری میں بدل جاتی۔

میں سارہ راستہ سوال پر سوال کیے جاتی اور چوکیدار جواب دیتا جاتا۔ ''پہاڑ کی چوٹی کے اس حصہ کا نام ''طلاق پڑی'' کیوں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اتنے میں ایک آدمی سامنے آتا ہوا دکھائی دیا۔ چوکیدار نے مسکرا کر اس کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ''بی بی۔ اسی کے باپ غلام حسین کی وجہ سے اس جگہ کا نام ''طلاق پڑی'' پڑا ہے۔''

''اس جگہ کا نام ''طلاق پڑی'' پڑا ہے۔''

''اس کا باپ کیا زندہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں! یہی پچانوے برس کا ہوگا۔ یہ واقعہ کوئی پچھتر برس پُرانا ہے اور پچھلے پچھتر برس سے ساری وادی اس جگہ کو 'طلاق پڑی' کہتی ہے، وہ بولا۔

''اس سے پہلے اس کا کیا نام تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلے تو کوئی نام نہ تھا لوگ بھی لکڑیاں اور گھاس لینے کبھی کبھار چلے جاتے تھے۔''

چوکیدار نے واقعہ بیان کرنا شروع کیا۔ میں بغور سنتی رہی۔ اپنے تصور کے خاکے بنتی رہی۔ اس کا باپ بھی سی وقت جوان تھا۔ بیس سال کا چُلبلا جوان میں نے ''بیٹے'' کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے سوچا۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک نہ تھی۔ وہ جوان تو تھا مگر آنکھوں کے کونے سخت پہاڑی موسم اور کڑی محنت کے باعث جُھریوں میں چھپے تھے۔ اس کا چہرہ خشک اور کھردرا تھا۔ مونچھوں اور داڑھی کے بے رنگ بال ہلکی دھول میں اٹے تھے۔ اس نے خفیف مسکراہٹ سے مجھے دیکھا۔ سیاہ آنکھیں جھپکائیں اور سلام کو جواب دیئے بغیر منہ موڑے اپنے راستے پر ہولیا۔ چوکیدار اس کے باپ کی کہانی سناتا رہا۔ میرا تصور اُسے ڈھالتا رہا۔

''میں آج پھر جلدی آنے کی کوشش کروں گا'' غلام حسین نے ''کنہار'' کا پل پار

کرتے ہوئے سوچا۔

اس کی شادی کو کچھ ہی عرصہ ہوا تھا۔ بیویاں تو سبھی لاتے ہیں۔مگر زرگئی اس کے من میں بس سی گئی تھی۔اسے دیکھتے ہی اس کے روئیں روئیں میں مستی کی لہر دوڑ جاتی۔ ہونٹوں پر خود مسکراہٹ کھل اٹھتی۔اعضاء میں ہلکا میٹھا لرزہ اور ایک پر کیف کیفیت سارے وجود میں ہلکورے لینے لگتی ذہن ہلکا سا ہو جاتا۔اس کی نگاہیں خواہ کہیں بھی ہوں۔اسے چاروں سمت زرگئی ہی نظر آتی جھومتے درختوں میں اس کے لانبے کُرتے کا پھیر گھومتا نظر آتا۔سرسراتی ٹہنیوں میں زرگئی کے پلو کی شبیہ نظر آتی۔وہ پہاڑ پر چلا جا رہا تھا۔کہنار کو دور ہوتا ہوا مدھم شور جیسے زرگئی کی چاندی کی چوڑیوں کی جھنکار ہو۔

گھر میں بھی وہ اس سے بہت کم بات کر سکتا۔ماں آنگن میں سارا وقت ہی موجود ہوتی۔وہ کسی نہ کسی بہانے آ بیٹھتا۔آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں ہوتیں۔ہونٹ مسکراتے رہتے وہ بے خود اسے دیکھتا چلا جاتا۔

''لکڑیاں اور گھاس لانی ہے۔تم کب جاؤ گے، دن گزرتا جا رہا ہے۔'' اس کی ماں اسے پیار سے جھاڑ پلاتی۔

غلام حسین کو گھر سے رخصت ہونا ہی پڑتا۔وہ زرگئی پر الوداعی نظر ڈالتا۔''ابھی گیا اور ابھی آیا۔'' کہہ کر کلہاڑا ہاتھ میں تھام گھر سے روانہ ہو جاتا۔

زرگئی اسی لمحہ کھرپا لیے کھیتوں کا رخ کرتی اور جب تک وہ موڑ پر اوجھل نہ ہو جاتا، اس کی تنی پشت اور کاندھے پر جھولتی رسی کو دیکھتی رہتی۔سارا دن دور جنگل میں پہاڑ کی چوٹی پر غلام حسین کو اپنی پشت پر زرگئی کی نظروں کا لمس محسوس ہوتا رہتا۔

سردیاں آنے کو تھیں۔ بہت ضروری ہو گیا تھا کہ گھاس اور لکڑی کے ذخائر ابھی سے اکٹھے کر لیے جائیں۔ ''نارانی'' زیادہ وقت جنگلوں اور اُونچی گھاٹیوں میں صرف کرتے۔ گھاس کے بڑے بڑے گٹھے کاٹ اور باندھ کر اور زیادہ سے زیادہ لکڑیوں کے ڈھیر چھانٹ کر نیچے لانے کی کوشش کرتے۔ غلام حسین کا سارا دن بھی جنگل میں ہی گزرتا۔ وہ صبح جاتا اور سورج غروب ہونے کے بعد ہی لوٹتا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے مویشی بھی گھاس اور لکڑیوں سے لدے ہوتے۔ اس دن وہ گائے اور بیلوں کے علاوہ بکریوں کو بھی ساتھ لے گیا۔ اسے چاہیے تھا کہ اپنا کتا بھی ساتھ رکھتا مگر جب سے زرگئی آئی تھی غلام حسین کتا گھر پر ہی چھوڑ جاتا تھا۔

اس دن گھاس کاٹتے، لکڑیاں اکٹھی کرتے، زرگئی کو سوچتے سوچتے، سارا وقت یوں گذرا کہ شام ہونے کا احساس ہی نہ رہا۔ غلام حسین نے جلدی جلدی گٹھ باندھے، بیلوں اور گائے پر لادے، ایک گٹھا خود اٹھانے کے لیے الگ سے تیار کیا، واپس جانے کی ٹھانی تو اسے بکریوں کا خیال آیا مگر دور، دائیں بائیں، آگے پیچھے حدِ نگاہ تک ان کا کہیں پتہ نہ تھا۔

''یہ کیا'' وہ جھنجلا اٹھا۔ اس نے نگاہ اوپر اٹھائی تو اونچے پہاڑ کی چوٹی پر سلیٹی چٹانوں سے پرے، چیڑ کے درختوں کے بیچوں بیچ ہرسبز گھاس کے قطعے پر، ڈھلتے سورج کی سنہری کرنوں میں سفید سفید دھبے چمک رہے تھے۔

''یہ کم بختیں وہاں کہاں جا پہنچی۔ اب ان کے پیچھے جانا پڑے گا۔'' غلام حسین نے مویشیوں کے ریوڑ کو گھر کی جانب ہنکا کا اور خود بکریوں کو واپس لانے کے لیے ان کے پیچھے چٹانوں کے درمیان جا کر ختم ہو گیا۔ اور پر چڑھنے کے لیے غلام حسین کو اپنے کندھے سے بھی اُونچی چند جھریاں نظر آئیں۔ اس نے ان میں ہاتھ پھنسائے

۔بازو پر زور ڈال کر، کمر تک دھڑ اونچا کیا اور بمشکل اس جھری تک پہنچا۔وہاں اس نے قدم جمائے اور مزید اوپر چڑھنے کے لیے راستہ، شگاف یا جھری ہی کی تلاش میں نگاہ دورائی ۔اوپر کچھ بھی نہ تھا۔دیوار جیسی سفید چٹانیں غلام حسین کو گھور رہی تھیں اور ان کی چوٹی پر اسی کی بکریاں تنی کھڑی گردن جھکائے اسے یوں دیکھ رہی تھیں جیسے اس کی نا اہلی پر ہنس رہی ہوں ۔اَب غلام حسین کو اپنی حالت کا پورا احساس ہوا۔اس نے گھبرا کر نیچے دیکھا تو اس کا سر چکرا گیا وہ جھری جس میں پاؤں پھنسا کر وہ یہاں تک پہنچا تھا نظر سے گم ہو چکی تھی ۔وہ کچھ یوں اٹکا کھڑا تھا کہ جھک کر نیچے دیکھنا ناممکن تھا۔اگر وہ چکرا جاتا تو چٹان کی سلیٹ جیسی دیوار کے ساتھ ساتھ پھسلتا ہوا سو فٹ نیچے ڈھلوان پر جا گرتا اور پھر وہاں سے جو لڑھکنا شروع کرتا تو غالباً اس کی بچی کھچی ہڈیاں دریائے کہنار کی موجوں میں ہی دم لیتیں ۔اس کا چہرہ خوف سے زرد ہو گیا۔ماتھے سے پسینہ نکلا۔اسے زرگئی بالکل بھول گئی ۔اسے خدا یاد آنے لگا۔

''اے ربا تو ہی بچا تیری قسم ۔یہاں سے سلامت نکل جاؤں تہی ۔تیرے نام کی بکری قربانی کردوں گا۔'' غلام حسین نے گڑگڑانا شروع کر دیا۔

سُورج آہستہ آہستہ چوٹی کے اس پار ڈھلک گیا۔فضا میں خنک اندھیرا پھیلنے لگا۔ غلام حسین وقت کے ساتھ ساتھ ہمت بھی ہارتا جا رہا تھا وہ اپنی پشت چٹان سے چپکائے کھڑا تھا اترنے یا چڑھنے کی کوشش میں دماغ لڑا کر، عملی حل سوچنے کے بجائے ۔منتوں پہ منتیں مانگے جا رہا تھا۔وہ بکریوں پر بکریاں خدا کی نذر کیئے جا رہا تھا ۔

''او کوئی ایسی چیز مان جو تجھے ان بکریاں سے زیادہ عزیز ہے ۔تب کہیں جا کر

خدا راضی ہو گا۔"اس کے دل نے کہا۔

غلام حسین کو یکدم "زرگئی" یاد آئی ۔اس نے سوچا ۔دل مضبوط کیا اور پھر پوری عاجزی اور عقیدے سے کہا، "اے اللہ ۔اگر تو مجھے یہاں سے زندہ نکال لے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس پہاڑ پر پھر کبھی قدم نہ رکھوں گا اگر میں نے ایسا کیا تو میری سزا یہ ہو گی کہ میں "زرگئی" کو طلاق دے دوں گا۔ تیرے نام کی طلاق ۔میری مدد کر میرے اللہ ۔یہ میرا تیرے سے وعدہ ہے۔"

غلام حسین کے لیے زرگئی بہت قیمتی تھی --اتنی کہ اس کے سامنے اس کی بکریاں، اس کی مویشی، اس کے کھیت، اس کا گھر، سب کچھ ہیچ تھا اس وقت اسے بس ایک اپنی جان پیاری تھی اور اسے بچانے کے لیے زرگئی سے رشتہ بھی اس نے اللہ کی بھینٹ کر دیا تھا۔اس کے بعد وہ کچھ چپ سا ہو گیا۔

"اب اللہ جانے اور اس کا فیصلہ۔اللہ کے آگے کس کی چلی ہے ۔"غلام حسین نے سوچا ۔وہ سراسیمہ "اندھیرے میں" اُونچی چٹانوں کے بیچ ٹنگا ہ اللہ کے فیصلے کا انتظار کرنے لگا۔

جب اس کے جانور چرتے چراتے، پتھروں، چٹانوں کے کونوں کو منہ مارتے، خراماں خراماں، اندھیرا پڑے، اِکا دکا کرکے، گھر پہنچے تو زرگئی اور ماں خدشات سے بے چین ہو اٹھیں ۔انہوں نے پاس پڑوس کا آگاہ کیا۔واہ ویلا مچا۔جلد ہی قریباً سارا گاؤں جاگ گیا ۔سب ان کے گھر اکٹھے ہوئے یہی فیصلہ ہوا کہ آدھی رات تو گذر ہی گئی ہے، چند گھنٹے میں صبح کی روشنی ہو جائے گی ۔ننھی غلام حسین کی تلاش ممکن ہو سکتی ہے۔

صبح دم نارانیوں کا ایک گروہ کلہاڑیوں اور رسیوں سے لیس پہاڑ کی اونچی چٹان والی چوٹی کیجانب رواہ ہوا۔ وہ جلدی ہی وہاں پہنچ گئے۔ انوہں نے دیکھا کہ غلام حسین چٹانوں کے عین وسط میں، کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیئے۔ زرد چہرہ لیے، خدا جانے کس معجزے کے انتظار میں اٹکا کھڑا ہے۔ اگر وہ ہمت کر کے آنکھیں کولتا اور عقل استعمال کرتا تو اوپر نیچے نہ سہی، دائیں بائیں بہت سے ایسے شگاف تھے جن میں قدم جما کر، ذرا سا متوازی چل کر پھر بلندی کی جانب جا سکتا تھا اور اسی طرح چٹانوں کے اوپر پہنچ سکتا تھا اگر ہمت دکھاتا تو نہ سارا گاؤں پریشان ہوتا، نہ ان کی رات خراب ہوتی، اور نہ انہیں یوں اہتمام کے ساتھ اسے ڈھونے آنے پر وقت ضائع کرنا پڑتا۔

''وہ اغلام حسیناں!!!'' سب ہنس دیے۔ چند لوگ اوراوپر چڑھے۔ اسے رسی سے باندھا۔ اس کا بوجھ اپنے کندھوں پر سہتے اسے آہستہ آہستہ بحفاظت نیچے لائے۔ وہ خوف اور بے خوابی سے ادھ موا ہو رہا تھا۔

نیچے اتار کر انہوں نے اسے کچھ دیر بٹھایا۔ کندھوں، کمر اور ٹانگوں کی مالش کی، سر کو خوب ملا۔ بکری کے دودھ کی دھاریں، منہ میں ڈالیں۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد غلام حسین کے ہوش ٹھکانے آئے۔

اس کے ناران پہنچنے سے قبل ہی یہ خبر سارے گاؤں میں پھیل چکی تھی۔ پل کے پاس کافی لوگ جمع تھے۔ اسے دیکھتے ہی سب مسکرا پڑے۔

''او بڑی پہاڑی سر کی ہے تو نے غلام حسیناں'' اکثر نے فقرہ کسا۔

گاؤں کے قریب پہنچا تو ہر آنگن کے دیوار سے جھانکتے، عورتوں نکے پلو میں چھپے

چہروں کی مسکراتی آنکھیں اسی پر جمی تھیں ۔ بچے دوڑ دوڑ کر اسے دیکھنے یوں آ رہے تھے جیسے ایک رات میں ہی وہ کوئی عجوبہ بن گیا ہو۔ گھر کے پاس پہنچا تو اس کی ماں کی سہیلیاں جلدی سے خدا حافظ کہہ کر اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں۔

اندر داخل تو زرگئی اپنے اکلوتے کمرے میں جا گھسی ۔ ماں چپ چاپ تنور میں لکڑیاں سلگانے لگی ۔غلام حسین کل سے بھوکا جو تھا۔

اسکے بعد غلام حسین نے ان چٹانوں کو کبھی رک نہ کیا۔ ''دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے وہاں نہیں جاؤں گا۔ ورنہ زرگئی کو طلاق دینی پڑ ی گئی ۔ میں نے اللہ سے وعدہ جو کیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

اس دن کے بعد ان چٹانوں کا نام اسی واقعہ کی مناسبت سے ''طلاق پڑی'' ہو گیا۔ اس نام کی تاریخ صرف پچھتر سال پرانی ہے۔ اب تو ساری وادی کہنار میں پہاڑ کی چوٹی پر چٹانوں کا وہ حصہ طلاق پڑی کہلاتا ہے۔ یہ کافی دشوار گذار ہے میرے بیٹے نے بھی ان پر چڑھنے کی کوشش کی مگر انہیں سر کئیے بغیر ہی لوٹ آیا۔ اس نے غلام حسین کی کہانی جو سن رکھی تھی۔

پچھلے چودہ برس میں، میں نے ناران کے اس اخروٹ کے چھدرے جنگل والے حصے میں، بتدریج تبدیلیاں ہوتی دیکھیں۔ نجی گھروں کا منصوبہ منسوخ ہوا۔ تو قریباً ساری زمین ادارہِ سیاحت نے لے لی۔ قریباً دو سال مصروفیت اور گہما گہمی کا عالم رہا ۔ کراچی اور لاہور سے کارندے بلائے گئے دریا کے کنارے، خوبصورت مقامات پر غیر ملکی طرز کے، لکڑی اور ٹین کے چھتوں والے گھر بنائے گئے ان کی اندرکی سجاوٹ پر آسائش تھی یہاں وہاں، کہیں کسی چٹان کے ٹکڑے، کہیں کسی چیڑ کے خوبرو درخت

کے آگے پیچھے لکڑی کے گھروندے سجائے گئے ۔ یہی بس ایک کمرہ اور ایک غسل خانہ تھا مجھے انہیں دیکھ کر سوئٹزر رینڈ کے ''سکی ہٹ''"Skihut" یاد آ گئے ۔ ان کے گھروں میں رہنے کا کرایہ بھاری تھا۔ ان گھروں کے مابین راستے اور راھداریاں بنائی گئیں ۔ ایک کلب کی بنیاد رکھی گئی ۔ اس کی سجاوٹ دیدہ زیب تھی ۔ ٹینس کورٹ بنانے سے متعلق بھی منصوبے بنتے تنے گئے ادارہ سیاحت کے حکام ناران کے بیچ اس جگہ کو ایک بہترین تفریحی قطعہ بنانا چاہتے تھے۔

اس سال ہم بھی انہی گھروں میں سے ایک میں ٹھہرے ۔ رستوران کا خانساماں انٹر کانٹینینٹل سے تھا جو مانگو تیار ملتا کھانا چننے اور کھلانے کا انداز مغربی تھا۔ ہمارے گردو نواح کے اکثر گھر اسلام آباد سے آنے والے سفید فام سیاحوں سے بھرے تھے ۔ ایک ٹولی جاتی تو دوسری آ جاتی ۔ ارگرد چند ایک جگہوں پر خیمے بھی لگے تھے ۔ اس سال ان میں بھی سیاح ٹھہرے تھے ۔

دوسرے سال کسی وجہ سے ہم نہ جا سکے ۔

اب جو گئے تو وہی اٹھکیلیاں کرتا، صرف ستھرا دریا تھا وہ سیف الملوک کا طوفانی نالہ اور وہی بازار تھا۔ فضا دریا کے ہلکے ہلکے شور سے گونج رہی تھی مگر ادارہ سیاحت کے دو سال قبل بنے ہوئے خوشنما گھروں کی حالت خستہ تھی ۔ گھروندوں کی چھتیں ٹوٹ چکی تھیں ٹین ٹوٹ کر دیواروں سے جا لگے تھے بجلی کے تار ادھر اُدھر لٹک رہے تھے ۔ غسل خانوں کے فلش کیڑے مکوڑوں کی جائے پناہ بنے تھے ۔ چند گھروں کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے ۔ ان پر ٹین کے بھدے ٹکڑے ٹھونک کر کچھ مرمت سی کر دی گئی تھی ۔ ان شکستہ اور بے آباد گھروں کے بیچ پگ ڈنڈیاں پتھروں اور جھاڑیوں کو چھوتی ادھر سے اُدھر گذرتی ویسے ہی زیبا لگ رہی تھیں ۔ ان کی بے ہنگمی نے وادی کی

زیبائی پر کوئی اثر نہ ڈالا۔اور نہ ہی ادارہ سیاحت کے اکلوتے رستوران اور اسلام آباد سے سفید فام سیاحوں کی آمدورفت نے وادی کی غربت کو متاثر کیا تھا۔طوفانی نالے کے قریب بنا تیل سے چلنے والا جنریٹر خراب ہوگیا تب بھی نارانیوں کو کچھ فرق نہ پڑا۔اس کی بجلی تو صرف اسی قطعہ میں جاتی تھی۔

ناران حسین ہے۔اس میں رہنے والے غریب ہیں۔اس غربت اور حسن کے مابین، دریا کے کنارے، ایک محدود احاطہ میں، پاکستان کے چند شہروں میں بسنے والے بیسویں صدی کے وقت کو کھینچ کر لایا گیا ہے۔سفید فام لوگ اور ہمارے جدید شہروں سے جدید وقت کے شہری، اس پس ماندہ اور خوبصورت گاؤں کے، اس بیسویں صدی زدہ قطعہ میں، ہر سال چند ہفتے کے چھٹیاں گذارنے آتے ہیں۔

ٹراوٹ مچھلی کا شکار کرتے ہیں۔ یہاں کا مناظر کو سراہتے ہیں ناران کے غریب بازار کی گرانی اور ادارہ سیاحت کے اونچے نرخوں کا رونا روتے ہیں۔ بہت سی تصویریں کھینچتے ہیں۔اور واپس چلے جاتے ہیں۔

ان کے آنے جانے کا نارانیوں کی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

پچھلے چودہ برسوں میں یونس شکاری کا قرضہ ایک سو پچاس روپے سے ایک ہزار چھ سو روپے ہوگیا ہے۔گل علی آرام گھر کے مکینوں کا کھانا چوری کرنے اور سودا سلف میں بے ایمانی کے باوجود تیرہ سو روپے کا مقروض ہے۔ایک چوکیدار پشاور تبدیلی کروانے کی درخواست لے کر آیا تھا۔ادارہ سیاحت کے سب گھروں کے اکلوتے جمعدار کی تنخواہ میں واجبی اضافہ ہوا ہے مگر بچے اَب سات ہیں۔

گردونواح کے موضع جات سے اس سال بھی سات سات، نونو میل کی مسافت

پیدل طے کرکے قریباً چار جوڑے، اپنے معصوم اور بیمار بچوں کو بخار کی تمازت میں پھنکتا ہوا۔ اٹھا کر میرے پاس دوائی مانگنے آئے۔ ان کی آنکھوں سے بے بسی جھلکتی تھی۔ ماں کے ہونٹ درد کی نرمی سے پھیلے تھے۔ ماتھے پر فکر کی لکیریں تھیں۔

''میں ڈاکٹر نہیں۔ اتنے معصوم بچے کو دوائی نہیں دے سکتی۔ تم اسے ناران بازار کی ڈسپنسری میں لے جاؤ۔'' میں نے بی اسپرو کی گولیاں دیتے ہوئے کہا۔

''ایک گولی کھلا دو۔ اس سے بخار کی شدت کم ہو جائے گی۔ باقی رکھ لو۔ مگر یہ اس کے مرض کا علاج نہیں۔

عورت نے گولی کو یوں پکڑ لیا جیسے پیر صاحب کا دیا ہوا تعویز ہو۔ وہ شوہر کا بازو تھامے بچے کی قیمتی پوٹلی سینے سے لگائے واپس ہو لی۔

''یہ لوگ ناران ڈسپنسری کیوں نہیں جاتے۔'' میں نے اپنے شوہر سے بے بسی سے پوچھا۔

''بچہ بہت بیمار ہے نا''۔

''دم دما'' کا موڑ مڑتے ہی وادی اپنا انداز بدل لیتی ہے۔ سامنے کا پہاڑ اتنا اونچا نہیں، نہ اس پر درخت ہیں، نہ بڑی چھوٹی چٹانیں ہیں، نہ پتھر نہ جھاڑیاں بس گھاس ہی گھاس ہے۔ ہلکے سبز رنگ کی یہ گھاس چوٹی تک یوں پھیلی ہے، جیسے سبز قالین منڈھ دیا گیا ہو۔ چند ایک پگ ڈنڈیاں خاکستری لکیروں کی طرح اُدھر اُدھر، چند گھروں کو آتی جاتی ہیں۔ یہ گھر گتے کے ڈبوں کی طرح، سبز پہار میں، پیوست دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے اندر کسمپرسی رہتی ہے ان میں بسیرا کرنے والوں کی شکل پر ازلی بھوک طاری رہتی ہے۔ ان کی آنکھوں میں مُردہ روشنی ہے گویا ذہانت کے خلئے

کمئی خوراک کے باعث کبھی کے دم توڑ چکے ہوں۔ چھوٹی عمر میں بوجھ اٹھانے سے ان کی قد کبھی لمبے اور جسم کبھی سڈول نہ ہوں گے۔

سبز پہاڑ کے بالکل آگے دریا کہنار آہستہ آہستہ رواں ہے۔

اس روز اس کا پانی سبزی مائل نیلا تھا۔ یہ صاف شفاف دریا، دو تین شاخوں میں بٹ کر اور پھر مل کر، سرسبز جزیرے بناتا، پتھروں، کنکروں اور ریت کے چھوٹے یا لمبے ساحلوں سے ٹکراتا رینگ کر بہہ رہا تھا۔

ہماری جیپ متبادل پہاڑ کے ساتھ ساتھ لگی، گرد آلود کچی سڑک پر جھٹکے کھاتی گذری۔ ''سوجھ'' آرام گھر ایک پہاڑ نما ٹیلے پہ بنا تھا ''سوجھ کے حسن سے محفوظ ہونے کے لیے یہ ٹیلا بہترین جگہ تھی اس ٹیلے پر آلوؤں کے چند کھیت بھی تھے۔

اس کی کالی قمیض ہوا میں لہرا رہی تھی۔ دوپٹہ بنے پر دھرا تھا۔ مینڈھیوں سے گندھا سر کانسی پھولدار ٹوپی میں چھپا تھا۔ کالی قمیض کا، پشت کے بالوں سے نیچے کا حصہ کثافت اور چکناہٹ کے باعث سیاہ تر ہو رہا تھا۔ دھوپ چمک رہی تھی۔ اس کا حسین چہرہ تمتماتا رہا تھا۔ خوبصورت خدوخال دھول کی ہلکی تہہ میں ڈھکے تھے۔ کشادہ سیاہ گھنی پلکوں کے نیچے چھپی ہوئی تھیں۔ ہونٹوں کے اوپر پسینے کے آب دار موتیوں میں مٹی گھل رہی تھی مضبوط ہاتھوں کی پکی ہڈیوں والی انگلیوں میں چاندی کے چند چھلے نظر آ رہے تھے۔ کانچ اور چاندی کی چوڑیاں کھنکاتی، وہ بیلچہ اٹھائے، آلو کی کھیت میں گوڈی کر رہی تھی۔۔ اس کا بچہ بنے پر بیٹھا۔ اپنے گرد آلود ہاتھ چوس رہا تھا۔ پاس ہی سبزے کے قطعے پر گائے چر رہی تھی۔

یہ خاموشی، حسین وادی! ہلکے ہلکے بہتا دریا۔ سامنے سبزہ زار پہاڑ! کتنا حسین ہے

یہاں اور کتنا پرسکون حسن!

جیپ نے ہارن بجایا۔ بچہ چونک کر رو پڑا۔ عورت بیلچہ چھوڑ بچے کو اٹھانے لپکی تو گائے نے سبز قطعہ چھوڑا، بنا پار کیا اور آرام سے آلو کے پودے چرنے شروع کر دیئے۔ عورت نے ایک ہاتھ سے سنبھالا، دوسرے ہاتھ میں سوٹی لی اور گائے کو ہانکا۔

جیپ رک چکی تھی۔ سب نیچے اترے اور مچھلی پکڑنے کے سامان، دوربین کیمرہ، اور دوپہر کے کھانے کے سامان سے لیس دریا کی جانب روانہ ہوئے۔

"ذرا اپنی گائے کو پرائے کرنا"۔ میں نے اس عورت کو ہزاروالی میں پکارا۔

"اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ میرے شوہر پر نظر پڑتے ہی اس نے اپنی نیلی آنکھیں جھپکائیں، مڑی، جھپٹ کر دوپٹہ اٹھایا۔ ٹوپی میں پوشیدہ سر کو ڈھانپا۔ پھر سوٹی لی اور گائے کو اور بھی پرے ہانکنے لگی۔ اس کا بچہ سوکھی ٹانگوں کے بل کھڑا۔ غلیظ کرنے میں پھولا پیٹ چھپائے، ہمیں گھور رہا تھا۔ اس کے سر کی ٹوپی پر موتیوں کی نفیس اور خوبصورت جھالر تھی۔

ہم "سوجھ" آرام گھر کے ٹیلے سے نیچے اترے اور قریباً بیس منٹ چلنے کے بعد دریا کے اس ساحل پر جا پہنچے جہاں اچھا شکار ملنے کی اُمید تھی۔ میرے شوہر اور بیٹوں نے کانٹے سیدھے کیے اور مچھلی کا شکار شروع کر دیا۔

یہ جگہ بہت ہی خوبصورت تھی۔ میرے پیچھے کی ڈھلوان پر جا بجا شفاف پانی کی چھوٹی چھوٹی ندیاں ادھر ادھر بہہ رہی تھیں۔ سڑک کے پاس ایک چشمہ تھا جس کا پانی رس رس کر ان نالیوں کی صورت میں بہہ کر دریا میں گر رہا تھا۔ جا بجا چھوٹے بڑے پتھر

اور چٹانیں تھی زمین پر ریت کی تہہ تھی انہی پتھروں اور ریت کے بیچوں بیچ سبز مخملی گھاس کے ٹکڑوں کا جال سا بنا تھا اسی طرح کیا یک ٹکڑے پر میں نے اپنی بچوں کی سویٹریں رکھیں۔ چادر بچھائی۔ چھتری کی آڑ بنا کر تیز دھوپ کو روکا اور ایک چٹان کا سہارا لے کے بیٹھ گئی کہ کتاب پڑھ سکوں میری پشت میرے بچوں کی طرف تھی۔

دریا کا شور ان کی آوازوں پر مسلط تھا۔ جلد ہی میں کتاب میں کھوسی گئی۔ پڑھتے پڑھتے مجھے یوں لگا جیسے کوئی میرے چہرے کو بغور دیکھ رہا ہے۔ میں نے نظریں اٹھائیں چار غلیظ آنکھیں، جن میں کالے سرمے کی دھاریاں تھیں، کونوں پر بلب جمی تھی۔ میرے چہرے پر نہ جانے کب سے چسپاں تھیں۔ میں نے ان کا جائزہ لیا۔ وہ دو لڑکے تھے۔ ان کے سروں پر میلی کچیلی کالی ٹوپیاں تھیں ایک کے گلے میں قمیض برائے نام تھی پھٹا ہوا، گندا چیتھڑا ٹنگا تھا جس کے مختلف سروں کو گردن کے گرد کے گرد بل دے کر ایک سیفٹی پن سے اٹکا دیا گیا تھا۔ اس کے نیچے اس نے پیوند زدہ شلوار پہن رکھی تھی اس کے بے جراب پاؤں میں ربڑ کے سستے بوٹ تھے۔

دوسرے لڑکے کے کپڑے اتنے بوسیدہ نہ تھے۔ ملیشیا کے رنگ کا مکمل جوڑا تھا۔ البتہ وہی بوٹ اور جرابیں عنقا۔ یہ دونوں لڑکے، سنجیدہ صورت لیے، بے تاثر چہرے اٹھائے، مجھے یوں دیکھ جا رہے تھے جیسے میں کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہوں میں نے انہیں نظر انداز کرنے کی کوشش کی مگر وہ مسلسل گھورتے چلے جا رہے تھے۔ آخر جھنجلا کر میں نے۔ کہا "جاؤ بچو" اُدھر دور جا کر بیٹھو۔"

وہ خاموشی سے اٹھے۔ ذرا دور جا کر بیٹھ گئے۔ مگر اب بھی کنکھیوں سے بار بار مجھے دیکھ لیتے۔

میرے توجہ کتاب سے ہٹ چکی تھی۔ میں اپنے بچوں کو دیکھنے لگی میرے بیٹے کے کانٹے میں ٹراوٹ آ پھنسی۔ وہ آہستہ آہستہ اُسے کھینچ کر باہر لا رہا تھا۔ یونس شکاری بھاگا۔ اس نے مدد کی اور مچھلی باہر آ گئی۔ قریباً قریباً تین پاؤنڈ کی تھی۔ یونس نے اِسے کانٹے سے آزاد کیا اور ریت پر پھینک دیا۔ وہ اچھل اچھل کر تڑپ رہی تھی کچھ دیر کی جدوجہد کے بعد اس کا منہ خون آلود ہو گیا اس نے بے دم ہو کر ریت پر سر رکھ دیا وہ اَب تیز تیز سانس لے رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد مر جائے گی۔ میں اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔

وہ میلا کچیلا بچہ، سر کھجاتا، ننھے ننھے قدموں سے چشمے کی دھاریوں کے کنارے نرم مخملی گھاس پر قدم جماتا، ننھے جنگلی پھولوں کو روندتا میری طرف آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے اس کی ماں تھی۔ مجھے بیکار دیکھ کر وہ میرے ہی پاس چلی آئی اور مسکرا کر دوستانہ انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔

''تمہارا بچہ بہت پیارا ہے، ماشا اللہ''۔ میں نے چھوٹو کے پھولے پیٹ کو نظر انداز کر کے سفید گالوں اور نیلی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بچے تو آپ کے خوبصورت ہوتے ہیں جی۔ ہم غریبوں کے کہاں۔ نہ کھانے کو نہ پہننے کو، اور پڑھانے کا تو سوال ہی نہیں خدا آپ لوگوں کو اور بھی دے۔ ہم غریبوں کی زندگی تو بس امتحان ہے جس میں سے عمر بھر گذرنا پڑتا ہے۔'' وہ بولی۔

''کیا تم سارا سال یہیں رہتے ہو؟'' میں پوچھا۔

''نہیں جی۔ گرمیوں کے لیے آ جاتے ہیں۔ سردیاں بالا کوٹ میں گذارتے ہیں''۔ اس نے کہا۔

''کیا پیدا کرتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''آلو'' وہ بولی۔

کیا آلو کافی نہیں ہوتے؟''

''آلو تو جی کافی ہوتے ہیں مگر ان کی قیمت کچھ نہیں ملتی۔ زمین مالکوں کی ہے۔ محنت ہماری فصل ہماری۔ ''جریذ'' سے ''چیلاس'' تک کوئی بیوپاری آلو کی ایک بوری بھی اس وادی سے باہر نہیں لے جا سکتا جب تک دس روپیہ فی بوری مالکوں کو ٹیکس نہ دے۔ دس روپیہ فی بوری مالکوں کے دے کر بیوپاریوں کے پاس ہمیں دینے کے لئے بچتا ہی کیا ہے اس بار تو تنگ آ کر ہم نے بہت تھوڑے آلو لگائے ہیں۔ اتنی محنت کیوں کریں جب وصولی کچھ بھی نہیں''۔ وہ بولی۔

''تم لوگوں نے ٹیکس دینے سے کبھی انکار نہیں کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''کے اتھا جی''۔

''دو سال پہلے۔ ہمارے آدمیوں نے ----- ساری وادی کے لوگوں نے ایکا کیا۔ اپنی فصل خود سنبھالی۔ خود بوریوں میں بھری اور خود ہی بالا کوٹ لیجا کر بیچنے چل پڑے۔ مالکوں کے آدمیوں نے راستہ روک لیا۔ ہمارے آدمیوں نے انکار کیا۔ ان لوگوں نے گولی چلا دی۔ ہمارے تین آدمی مارے گئے مقدمہ اب تک چل رہا ہے خدا خبر فیصلہ کب ہو۔ دوسرے سال ہمارے آلو پڑے پڑے سڑ گئے۔ نہ وادی سے کوئی آلو باہر جا سکا، نہ ہی کوئی بیوپاری انہیں اٹھا سکا۔ مالک بہت سخت ہیں۔ یہاں تو ان کی بہت چلتی ہے۔ وہ تو ہر گرمیاں ہم سے ہمارے اپنے ریوڑ وادی کے اندر لانے کا بھی ٹیکس وصول کرتے ہیں''۔

''کتنا؟''میں نے پوچھا۔

''ہر بیل، گائے اور بکری پر اندازاً چار روپے فی گائے سے ڈیڑھ روپیہ فی بکری تک ۔یہ ان کی مرضی ہے گھٹا بڑھا بھی سکتے ہیں''۔وہ بولی۔'' تو تم اپنے مویشی، اپنے ہی گھروں اور زمینوں پر لانے کے لیے ان کے پ• یسے دیتے ہو۔؟''میں نے پوچھا ۔

''کیا کریں جی''وہ عورت تھکے ہوئے لہجے میں بولی ۔

میری نظریں بار بار اس کی نیلی آنکھوں، زرد رخساروں، جھریوں زدہ ہاتھوں اور غلیظ لباس پر جا رکتیں۔

وہ عورت---------میں عورت ۔

اس کی زندگی-------میری زندگی۔

اس کے مصائب-----میرے مسائل ۔

میری سہولتیں!میری تعلیم!میری فراغت!میری ذمہ داریاں!!

اس کی ہڈیوں کا نچوڑ آلو ہیں۔آلو جن کا خون کسی اور کے مستقبل کو سینچتا ہے۔

میں اس ''بدر جمالہ'' کو جاتے دیکھتی رہی ایک چبھن دِل میں لئے جو چند دنوں میں مٹ جائے گی ۔اور میں اپنی سہل زندگی کے نرم مسائل میں اُلجھ کر اسے بھول جاؤں گی۔

مالکوں میں میری دلچسپی بڑھ گئی ۔ میں نے یہاں کے منتخب حکمرانوں سے متعلق

چھان بین شروع کردی۔ بہت سے نارانیوں سے پوچھا ان میں عورتیں، لڑکے، بوڑھے، جوان سبھی تھے۔ سبھی کے دل میں آلوؤں کا سانحہ چھپا ہوا تھا۔

''یہ مالک کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

نارانیوں نے میرے اس سوال کو جواب کچھ اس طرح دیا کہ بہت سال پہلے انگریزوں کی حکومت تھی۔ سر ایبٹ، ایبٹ آباد دورے پر آیا۔ اس نے وادی۔ کہنار بھی آنا چاہا۔

اس دن کی صبح بھی ہر صبح کی طرح روشن تھی۔ اہل وادی کہنار سرِ سحر بیدار ہوئے۔ نماز سے فارغ ہوئے۔ پھر اپنے مویشیوں کے اصطبل صاف کرنے میں مصروف ہو گئے۔ گھروں کی چمنیوں سے دھوئیں کی دھاریاں ساکت فضا میں جا بجا بلند ہو رہی تھیں۔ گھر گھر، گھوڑوں پر دندناتے ہوئے ہرکارے آئے۔ ایک اہم پیغام لیے۔ وادی کے باعزت اور بارسوخ مالک خاندان کے سربرہ نے جرگہ طلب کیا تھا۔

''خیر تو ہے'' سب نے متفکر ہو کر پوچھا

''پرسوں ہی پتہ چلے گا''۔ جواب ملا۔

کاغان کے گردونواح کے لوگ جلد ہی پہنچ گئے۔ دور دراز کے گاؤں والوں کو اپنا سفر ایک روز قبل شروع کرنا پڑا۔ مالکوں کی ایک قابل ستائش واقعے کی بنا پر علاقے میں خاص اہمیت اور عزت تھی -- واقعہ جو صدیوں قبل پیش آیا تھا مالکوں کے جد امجد نیا اہل وادی کہنار پر کتنا بڑا احسان کیا تھا اپنے محسن کی اولاد کے بلاوے کو وہ کیسے اہمیت نہ دیتے ایک شام قبل ''چیلاس'' سے لے کر ''جرید'' تک ہر گاؤں سے ایک یا دو

نمائندے کاغان پہنچ گئے انہوں نے دریا کے کنارے ہی پڑاؤ ڈالا ۔ گھوڑے باندھے ۔ گاؤں کی مسجد میں مجلس لگی ۔ تبادلہ خیالات ہوا مالکھوں نے سب کی آؤ بھگت کی ۔ سونے اور کھانے کا انتظام عمدہ تھا ۔ دوسرے صبح، نماز کے بعد، چائے پانی سے فارغ ہوتے ہی جرگہ کا آغاز ہوا مسجد سے باہر زمین پر نشست ہوئی ۔ مالک خاندان کا بزرگ جرگے کی صدارت سنبھالے تھا ۔ اس نے کہنا شروع کیا:

''بہت تشویش ناک خبر ہے ۔ آپ لوگ تو جانتے ہی ہیں کہ ہندوستان کے سب علاقوں پر انگریزوں کی حکومت ہے ۔ ہمیں اتنے سال پہاڑوں کی اوٹ راستے کی دشوار گذاری اور موسم کی سختی نے بچائے رکھا ۔ اب اس ظالم و جابر انگریز حکمران کا رخ ہماری جانب بھی ہو چلا ہے ۔ سرایبٹ آرہا ہے ۔ اس کی نیت ٹھیک نہیں ۔ تمہاری زمینوں پر قابض ہونے کا ارادہ رکھتا ہے ۔ یہاں کے مردوں کو گرفتار کر کے بیگار کے لیے لے جانا چاہتا ہے ۔ اس کے متعلق بہ تفکر مندانہ اطلاعات ملی ہیں ۔''

فرنگیوں کی آمد ---جبری ---قبضہ --- بیگار کی کڑی محنت اور مسلسل بھوک ----

ہمارے بیوی بچوں کا کیا بنے گا؟؟'' وہ خائف چہرے لیے، نگاہوں میں اعتبار کی لو جلائے بے اختیار بولے ۔

سید بردار نے کہا ۔ ''تم سب لوگوں سے میرے خاندان کو ہمیشہ سے ہی لگاؤ رہا ہے ۔ میرے جد امجد پہلے بھی ایسے ہی بُرے وقت سے آپ سب کو بچا چکے ہیں ۔ میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے ۔ اگر کوئی معترض نہ ہو تو اس پر عمل کیا جا سکتا ہے'' ۔

سب ہمہ تن گوش تھے ۔

"میرے مشورہ ہے کہ تم سب لوگ اپنے گھر بار چھوڑ کر اور بیوی بچوں کو ساتھ لے کر اونچے پہاڑوں اور گھنے جنگلوں میں چند دن کے لئے کہیں اِدھر اُدھر ہو جاؤ۔ فرنگی آئے تو میں اس سے سمجھ لوں گا۔ میں کہوں گا یہاں کوئی ہے ہی نہیں۔ بس ویرانہ ہے ۔اللہ کی لمبی خالی وادی ہے اور میں ہوں۔ مجھ سے اور میرے خاندان سے جتنی بیگار لیتے ہو تو لے لو۔ میری زمین حاضر ہے۔ استعمال کرتے ہو تو کرلو۔ فرنگی چند افراد سے کیا کام لے گا۔ بغیر کسانوں کھیتوں پر قابض ہو کر کے اوصول کرے گا۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ وہ اس جگہ کو بے آباد پا کر واپس چلا جائیگا اور پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کرے گا تمھاری زمین تمھاری محنت۔ تمھاری اپنی ہی رہے گی"

حالات بدل چکے تھے۔ فرنگیوں سے مقابلہ خودکشی کے مترادف تھا۔ مالک سردار کی تجویز معقول لگی۔ سب نے اسی پر اتفاق کیا۔ وہ خدشات سے دھڑکتے دل سے غازی بابا کی روح کو مدد کے لیئے پکارتے، دعائیں مانگتے، گھوڑوں پر سوار اپنے اپنے گاؤں کی جانب روانہ ہو گئے۔

کاغان میں سرایبٹ کی آمد کے اہتمام ہو رہے تھے۔ اور جرید سے چیلاس تک ہر گھر میں افراتفری مچی تھی۔ گائے، بیلوں، بکریوں کے ریوڑ اپنے کتوں سمیت ہانکے جا رہے تھے۔ خوراک وضرورت کا مختصر سامان باندھا جا رہا تھا۔ ہر گاؤں سے لوگوں کے چھوٹے چھوٹے قافلے کلہاڑیوں اور لاٹھیوں سے لیس گھنے جنگلوں کا رخ کر رہے تھے جنگل غیر محفوظ تھے۔ بیوی بچوں کو چند دن بھی باہر یوں ویرانے میں درختوں تلے رکھنا پرخطر تھا۔ مگر فرنگیوں سے مڈبھیڑ دہشت ناک تھی۔

"یہ چند دن بھی گذر جائیں گے اللہ کی آس پر"۔ انہوں نے سوچا۔ "بھلا ہو مالک سردار کا کہ کوئی راہ تو ڈھونڈ نکلی۔" چند ایک نے دعا دی۔ فرنگی سرایبٹ آیا تو مالک

سردار بصمد اہتمام خوش آمدید کے لیے کھڑا تھا۔ ساری وادی خالی تھی۔ کھیت فصلیں، باغات اپنے باغبانوں کے بغیر اس کی للچائی آنکھوں کو اپنے حسن سے محفوظ ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

''یہاں اور کون کون رہتا ہے؟ یہ زمینیں کن کی ہیں؟'' سر ایبٹ نے پوچھا۔

''ہماری ---یہ صدیوں سے ہماری ہی ملکیت چلی آتی ہے''۔

وادی کہنار کی فضاؤں نے جھرجھری لی۔ فصلیں اعتماد کے بے رحم قتل پر کانپ گئیں۔ درختوں کی ٹہنیاں بے قرار ملنے لگیں۔ پودے جھول جھول گئے۔ کونپلیں لرز اٹھیں۔ مگر فطرت کی یہ تڑپ کس نے دیکھی۔

سر ایبٹ نے برطانوی راج کی مہر لگائی اور ملکیت کے کاغذ مالک خاندان کو دے دیئے۔ اَب اس زمین پر مالک برطانوی راج کے نمائندے اور وادی کہنار کے مالک تھے۔ یا ہس کے مکین ان کی ملکیت تھے۔ ان کی محنت مالکوں کی بیگار تھی اب ان کی زمینیں مالکوں کے لیے ذریعہ آسائش تھیں مالکوں کے سربراہ کی مدد کی لیے حواریوں کی مسلح جماعت تھیں۔ اس عیش، اس حکومت کے بدلے اسے صرف ایک کام کرنا تھا۔ اسے برطانوی کام بھرنا تھا۔

فرنگی چلا گیا تو اہل وادی کہنار پہاڑوں سے امید کا دامن تھامے اپنے اپنے گھروں کو لوٹے۔ فرنگی سے مل لیتے تو بازی اس طرح نہ ہارتے جس طرح اپنوں کی سُن کر، اپنے بھروسہ کرکے ہار گئے۔

چند خون معاف، حواریوں کا خوف، مدافعت کی صورت میں جبر و تشدد --- یہ سب ہتھکنڈے بے دریغ استعمال ہوتے رہے۔ اور یہ لوگ اسطرح اپنے محسن کی اولاد ہی

کے ہاتھوں پرانے شکنجے میں جا پھنسے۔

تین سال پہلے کا آلوؤں کا سانحہ اس شکنجے کو کاٹ پھینکنے کے لیے پہلا وار تھا۔ اتنے بہت سے برسوں کی شکست لگاتار سہتے رہنے کے بعد پہلا وار ہو سکتا ہے کہ ادارہِ سیاحت کے بیسویں صدی زدہ قطع نے یہ جوت جگائی ہو۔!!!

آج سے قبل ناران سے میں جب بھی لوٹی خوش لوٹی۔ وہاں کے چند ہفتے سچ مچ کی چھٹی ہوتے تھے۔ ذہن تازہ۔ دل ہلکا۔ صحت اچھی۔ زاویہ نگاہ ان چند ہفتوں میں اتنا بدل جاتا تھا۔ جیسے روحانی غسل مل گیا ہو۔ اسی لیے ہم ہر سال جاتے رہے۔

اس بار گھر کا رخ کرنے لگے تو بات ہی اور تھی دل میں کسک تھی اور ذہن پر بوجھ میں نے پہلی بار ناران کا حسین چہرہ ہی نہیں دل بھی دیکھ لیا تھا۔

میں واپسی پر سوچ میں گم تھی۔ ہماری جیپ سے اڑتی دھول سرِ راہ آلوؤں کے کھیتوں پر پڑ رہی تھی میں نے انہیں دیکھا۔

آلو کے کاسنی پھول اپنی زرد زرد آنکھیں پھیلائے مجھے گھور رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں، ''ہمارے خون کا حساب دو۔''

جیپ دور ہوتی گئی۔ پودے آہستہ آہستہ اپنا منہ مجھ سے موڑتے گئے ان کا کاسنی چہرے ڈھل گئے مجھے پر لگی زرد آنکھیں عالم مایوسی میں جھک گئیں ان کے اداس وجود جیسے کہہ رہے ہوں۔

''تم جو اپنے گھر، اپنے بچوں، اپنی تفریحات میں الجھی ہو، تم جو محض اپنی انفرادی ترقی کی خواہاں ہو، تم جس کے پاس ہمارے گرد آلود چہروں، ہمارے وجود، ہماری

بے فیض محنت، ہماری اجتماعی پستی کے لیئے سوچ کے صرف چند لمحے ہیں، تمہاری لا ابالی دلچسپی سے تو پرڑی کی محبت اچھی ----!---------

بیسنگ گری

''ہنزہ'' کے بالمقابل، دریا کے ساتھ ساتھ، جہاں ہماری سرحد اُن بلند و بالا پہاڑوں سے جا ملتی ہے جن کی دوسری سمت چین اور روس آمنے سامنے کھڑے ہیں، ''نگر'' کا چھوٹا سا علاقہ ہے۔

یہ علاقہ ایک ملک تھا۔ بظاہر آزاد مگر دراصل اپنے ''تھم'' کے اختیار میں نگر کے نگری مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے، اپنے تھم کے زیر اثر، اسی کی خصلت و فطرت کے مطابق، آسودہ یا بے چین زندگی گزارا کرتے تھے۔

پہاڑ خشک تھے۔ زمین زرخیز مگر بارش کی محتاج تھی۔ درخت بارش ہو جانے پر خوب پھلتے پھولتے۔ پھلوں کی کثرت ہوتی۔ لوگوں کو وقت اچھا گذر جاتا۔ دریا تھا تو سہی، مگر ساتھ ساتھ لگا، ''نگر'' کی سرحدوں کو چھوتا گذر جاتا۔ ''نگری'' اسی پر سے رسیوں کے بنے پل کو جب پار کر کے ''نگر'' میں داخل ہوتے تو پھر جیسے احتیاج بدستور رہتی۔

دریا گویا ایک قدرتی، دفاعی وسیلہ تھا۔ پل کاٹ پھینکو تو کسی بھی حملہ آور کا ''نگر'' میں داخلہ ناممکن تھا۔

ضروریات محدود تھیں۔ زندگی سادہ ''تھم'' اچھا ہوتا تو زندگی سہل ہو جاتی۔ ''تھم'' ظالم ہوتا تو زندگی ایک لمبی مصیبت بن جاتی مگر یہ تو قدرت کی دین تھی۔ لوگ سالہا سال سے زندگی کے اس طرز کو نصیب کا لکھا جان کر قبول کرتے چلے آرہے تھے۔ اطاعت اُن کی گھٹی میں تھی۔ حقوق و مطالبات سے ناآشنا یہ قوم زندگی کے

اُس دائرے پر رواں تھی جو انہوں نے از خود اور اُن سے پلے کی نسلوں نے بھی خود ہی، رواج کے نام پر، اپنے گرد تان رکھا تھا۔ اس خود ساختہ بندش کے وہ اتنا قائل تھے کہ راہ بھولنے کے خیال کے ساتھ ہی انجانے کا لرزہ خیز خوف انہیں گھیر لیتا۔ اُن کی عادی قدم پرانی ڈگر پر رواں اُسی گھسے پٹے راستے کی ٹھوکریں کھاتے، زندگی کے سفر کو تھوڑی سی بھی ارتقائی تبدیلی سے آشنا کیے بغیر طے کر جاتے۔

نہ جانے ان رواجوں، ان بندشوں، ان محدود راہوں کے ڈور ''تھم'' کیسا تھ کیسے جا لگی! ''نگریوں'' میں سے ایک ہو کر بھی، رواجوں سے بے پروا، انہی کے خوف کو اپنی طاقت بنا کر وہ ان پر راج کرتے چلے آ رہے تھے۔

''ہینگ گری'' بہت ظالم ''تھم'' تھا۔ جب سے اُس نے گدی سنبھالی تھی، ''نگریوں'' کی زندگیوں سے رنگ اور حسن جاتے رہے تھے۔ اسے اپنی طاقت پر بہت ناز تھا۔ نگر کی حکمرانی اور لوگوں کی اطاعت نے اُسے سرشار کر رکھا تھا۔

اُس کا ذہن سارا وقت یہی کچھ سوچتا رہتا۔ ''نگر کو ایسا خطہ بنا دوں گا کہ دنیا جان جائے کہ ''ہینگ گری'' میں بھی کوئی ''تھم'' تھا۔ نگر میری عظمت کا عکس ہو گا۔ میری طاقت کا پرتو۔''

نگر میں اور لوگ بھی آباد تھے۔ اُن کی زندگیاں اُس کی ذمہداری تھیں، جن کا وہ محافظ مقرر کیا گیا تھا۔ وہ احساسات رکھنے والے انسان تھے۔ یہ آسان سی بات ''ہینگ گری'' بالکل بھول چکا تھا۔ اُسے صرف نگر کی سرزمین سے واسطہ تھا۔ اُس میں حیرت انگیز تبدیلیاں لا کر وہ اپنی انوکھی شخصیت کو نمایاں کرنا چاہتا تھا۔ اُس کا ذہن سارا وقت یہی کچھ سوچتا رہتا۔ ''ہینگ گری'' کو اپنی پھولی ہوئی انا کی تسکین

چاہیے تھی۔

اُس روز موسم بے حد خشک تھا۔ بہت دنوں سے بارش نہ ہوئی تھی۔ روکھی زمین پیاسی تھی اور گھاس تلے چھپی پڑی تھی۔ سبزے کا رنگ ماند پڑ گیا تھا۔ پھل پتوں کی آڑ میں سکڑے پڑے تھے۔

"کہیں یہ خشک فضا ہمارا رس ہی نہ چوس لے۔"

بیسنگ گری کافی دیر سے اپنے دالان میں کھڑا تھا۔ سارا نگر اُس کے قدموں تلے بکھرا تھا وہ اسے دیکھے جا رہا تھا۔

اونچا لمبا بیسنگ گری، چوڑے کندھے، تنا سینہ۔ نخوت سے اکڑی گردن لئے محوِ فکر تھا۔ چوڑے ماتھے۔ پر ایک گہری سلوٹ تھی جو کشادہ سیاہ آنکھوں کو اور بھی بارعب بنا رہی تھی۔ اس باوقار اور خوش شکل وجود سے اُٹھتی ہوئی تکبّر اور ظلم کی لہریں اردگرد کی فضا کو اتنا مکدر بنا رہی تھیں کہ اہل خانہ میں سے کسی کو دالان میں جانے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔

یکلخت اُس کی آنکھیں ایک نئے ارادے کی جھلملاہٹ سے چمک اُٹھیں وہ کھل اُٹھا۔ دالان کا ماحول بدل گیا۔ محل کے دریچوں سے کبھی کبھار جھانکتے چہروں سے خوف کا تاثر مدھم پڑ گیا۔ بیسنگ گری کو اپنے کئی دنوں کی سوچوں کا جواب مل گیا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے دالان میں چلنے لگا۔ اُس کا دماغ تیزی سے اُس خیال کی تصویر کشی کر رہا تھا۔ جو ابھی ابھی اُس کے ذہن میں اُترا تھا۔

"نگر میں ایک نہر بنانی چاہیے۔ دریا کا پانی نگر میں بہتا ہوا نگر کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک سیراب کرے گا۔ "بیسنگ گری" کی بنائی ہوئی نہر ایک شاندار

نہر ہوگئی۔ بہترین پتھروں اور بہترین مٹی سے تیار کی جائے گی۔ ''شلت'' کی سی اعلیٰ مٹی کہیں نہیں ہے۔ ''گوژیال'' کے پتھروں کا جواب بھی کہیں نہیں ہے۔ انہی دو کا استعمال کیا جائے گا۔ ''پامیر'' سے لے کر ''چترال'' تک میرے چرچے ہوں گے۔ ''سنکیانگ'' میں میرے تذکرے ہوں گے آتے جاتے قافلے ''مصر'' اور ''ایران'' تک میرا نام پہنچائیں گے۔ میری نہر ایک تاریخ بن جائے گی۔ صدیوں بیسنگ گری کی باتیں ہوں گی۔'' بیسنگ گری کا دل تو تھا ہی آہنی۔ اب تو اُس کی عقل بھی اپنی آئندہ کی شہرت کا تصور کر کے چندھیا گئی تھی۔

''نہرے کیسے بنے گی؟ اس کے امکانات کتنے ہیں؟ ''نگر'' کی زمین کے جغرافیائی اوصاف، نگریوں کی عقلی اور جسمانی صلاحیتیں؟ خام مواد اکٹھا کرنے کے وسائل؟ اوزار؟ کتنا عرصہ لگے گا؟ کام کے اوقات تعمیر کے مختلف پہلوؤں پر سوچ بچار؟ انسانی اور مالی اور مادی زاویوں کا تخمینہ؟ کیا زمیں اتنی نرم ہے کہ ہران کے سینگوں سے کھودی جا سکے؟ --- یہ سب باتیں بیسنگ گری جیسے طاقتور تھم کے لئے سوچنا غیر اہم تھا۔ بے شمار ارزاں نگری جانیں آخر کس لئے ہیں! بیسنگ گری کی انا کی تسکین کے لئے ہی تو ہیں!

رات بھر اُسے نیند نہ آئی۔ ہو بے چین اپنے محل کے دالان میں ٹہلتا رہا۔ اُس کے بس میں ہوتا تو نگریوں کو ابھی جگا کر جوت لیتا۔ اُس نے تاروں بھرے آسمان پر بے صبری سے نظر دوڑائی اور روشنی کا انتظار کرنے لگا۔

نگر کے سر پر ''مسوٹ'' تھا۔ یہ گاؤں پہاڑوں کو چھو کر ختم ہو جاتا۔ اُس کے بعد بلند و بالا، ناقابل گذر پہاڑ تھے۔ ''مسوٹ'' ''گل مت'' کے آخری اور نچلے سرے پر تھا۔ نہر کو وہاں تک پہنچانا اُس وقت کے وسائل کے پیشِ نظر ناممکن سی بات تھی۔ ''نگری''

لوہے کے استعمال سے واقف نہ تھے ۔کھدائی کے لئے ہرن اور مارخور کے سینگ استعمال کئے جاتے تھے ۔مگر بیسنگ گری کا ذہن شفاف پانی سے چھلکتی نہر دیکھ رہا تھا ۔اُس کی نہر نگر کو بیچوں بیچ کاٹتی پختہ بندوں سے سنبھلی ہوئی ۔گل مُت سے گذر کر مسوٹ تک جاتی تھی ۔ اُس کی صاف ستھری نہر اُس کی عظمت کے دمک لئے تھی---عظمت جسے بیسنگ گری کے بعد بھی قائم رہنا تھا اور نگریوں کو اُس کی یاد دلاتے رہنا تھا۔وہ یہی کچھ سوچتا بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔اب کے جو دالان میں گیا تو تخیل کی دنیا میں گم، رواں ذہن کے اندر چلتی نہر کی مختلف تصویروں سے محفوظ ہوتا تمام رات ٹہلتا رہا۔اُس کے گرد فضا کا رنگ بدلنا شروع ہو گیا۔پہاڑ کی چوٹیوں سے چھوتے آسمان کے کنارے سرخ ہو گئے ۔پرندوں کی چہچہاہٹ سے فضا گونجنے لگی ۔اُس کے اپنے گھر کی آہٹوں نے اسے چونکایا تو پھر کہیں بیسنگ گری کے قدم رُکے ۔

نگر کے گھر گھر ابھی چولہے سلگنے نہ پائے تھے کہ ہرکارے پہنچ گئے ۔''بیسنگ گری تھم نے تمام مردوں کو بلایا ہے''حکم دیا گیا۔

''ایسی کیا بیگار ہو گی کہ سارے ہی مردوں کی ضرورت پڑ گئی؟''عورتوں نے فکرمند ہو ہو کر سوچا۔

بیسنگ گری بہت بے درد تھم تھا۔اُس کے پیغامات لوگوں کو حواس باختہ ہی کیا کرتے تھے ۔مگر بات ماننے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ضروریات زندگی سے فارغ ہو کر، اپنے پالتو مویشیوں کا سارا کام اپنی عورتوں پر چھوڑ کر جلدی جلدی تھم کے محل کے باہر بڑے دالان کی طرف روانہ ہوئے ۔

پھر تھم نے اُن سب کو نہر پر جوت لیا۔

''شلت'' کوسوں دور تھا۔ دریا پر لٹکا رسیوں کا پل پار کرنا پڑتا۔ پھر چند گھنٹوں کی مسافت کے بعد شلت تک رسائی ہوتی۔ شلت دریا سے قریباً ایک ہزار فٹ اونچا تھا۔ اس کی مٹی چکنی تھی۔ اس میں ریت کی آمیزش نہ تھی۔ ایسی ستھری اور چکنی مٹی سارے نگر میں کہیں نہ تھی۔ نگر کی زمین ریتلی تھی۔ شلت کی مٹی خوب گوندھی جاتی تھی۔ اور تعمیر کے لئے بہت موزوں تھی۔

نگریوں کے صبح و شام کٹھن مسافت میں گذرنے لگے۔ اُن کا ایک ٹولا پو پھٹتے ہی شلت روانہ ہو جاتا۔ چمڑے کے تھیلوں اور کھاروں مٹی اُٹھا کر واپس لوٹتا تو شام ڈھل چکی ہوتی۔ فاصلہ بہت تھا اور مسافت کٹھن۔ بوجھ اُٹھا کر پل پار کرنا دشوار مٹی مناسب مقدار ہی میں لائی جا سکتی تھی۔

یہ مشکل سفر اب روزانہ کا معمول تھا۔ تاہم مٹی ضرورت کے مطابق اکٹھی نہ ہو رہی تھی۔ نگریوں کو یوں لگتا تھا کہ کھارے اور تھیلے ڈھوتے اُن کی عمر بیت جائے گی مگر مٹی کا وہ ذخیرہ نہ بن پائے گا جو تعمرے کے لیے ضروری ہے۔ گوژیال بھی شلت سے آگے، ہنزہ سے بھی پرے، دریا کے پار تھا۔ اُس کا فاصلہ بھی کوسوں دور تھا وہاں بھی رسیوں کا تنگ سا پل پار کر کے جانا پڑتا تھا۔ گوژیال کی ساری وادی چپٹے پتھروں سے اٹی پڑی تھی۔ یہ چھوٹی بڑی سلیں نہر کو پختہ کرنے کے لیے بہترین تھیں مگر انہیں مناسب تعداد میں اکٹھا کرنا مشکل ترین مسئلہ تھا۔

نگریوں کا دوسرا ٹولا صبح سویرے ہی گوژیال روانہ ہو جاتا۔ سلیں ڈھوئی جاتیں۔ اٹھائی جاتیں۔ کمر پر لادتے ہوئے ایک دوسرے کی مدد کی جاتی۔ پھر جب وہ واپس

ہوتے تو رات پڑے ہانپتے نگر پہنچتے۔

کچھ نگری نہر کھودنے میں مصروف ہو جاتے مگر جہاں ذرا زمین سخت ہوتی، ہاتھوں کا زور اور ہرن کے سینگوں کی نوکیں جواب دے جاتیں اور کھدائی کی رفتار سست ہو جاتی۔

سارے نگر میں اب کوئی بوڑھا، کوئی جوان، کوئی لڑکا اپنے ذاتی کام میں مصروف نظر نہ آتا۔ انھوں نے اپنی فصلیں، اپنے مویشی اپنے گھر بار اپنی بیویوں اور کمسن بچوں کے حوالے کر دیئے تھے۔ وہ خود پتھر ڈھونے، مٹی لانے اور نہر کھودنے کی تگ ودو میں رہنے لگے تھے۔ ان کے صبح و شام کڑی محنت میں گزر رہے تھے۔۔۔۔ محنت جس کا کوئی صلہ نہ تھا، جس کے بدلے انہیں شفقت تک نہ ملتی تھی، جس میں آرام یا مناسب خوراک کو کوئی دخل نہ تھا، جس میں بیمار ہونے کی کوئی اجازت نہ تھی، جس میں تھکاوٹ ایک نا قابل برداشت جرم تھا اور بھوک ایک بیزار کن حرکت تھی جو تھم کے صبر پر بھاری تھی۔

پتھر آرہے تھے، مٹی اکٹھی ہو رہی تھی، نہر کھدر رہی تھی، اس کی رفتار کی سستی تھم کی عجلت پسند طبیعت کو مشتعل کئے دیتی تھی۔ بات بات پر ان پر کوڑے برسائے جاتے۔ خوفزدہ نگری جتے ہوئے کام کرتے چلے جا رہے تھے۔

ان کے جسم پگھل رہے تھے۔ بازوؤں کی طاقت بہہ رہی تھی۔ سینوں کا زور ٹوٹ رہا تھا۔ مگر تھم کا خوف حواس پر ایسا سوار تھا کہ نہر بنانے کے سوا انہیں کوئی اور بات سجھائی نہ دیتی تھی۔ اسی طرح کافی سال گذر گئے۔

ان کی عورتیں اکثر سوچا کرتیں۔ ''نہر بناتے بناتے یہ سب کہیں مر نہ جائیں۔''

پنچی نے اخروٹ کی گریاں پتھر کی چوڑی اور پتلی سی سل پر جلائیں۔ جب وہ جل کر بھسم ہوگئیں تو انہیں باریک پیسا۔ سرما کیا۔ سرما ہو کر وہ اپنے ہی تیل میں مرہم بن گئیں۔ "سلمندر" نے درد کی ٹیس کو ہونٹ دبا کر بھینچا۔ قمیض اتاری اور آگ کی کانپتی روشنی میں زمین پر پڑے پٹو پر جا بیٹھا۔

وہ اتنا خستہ، اتنا ماندہ تھا۔ کہ اس نے اپنے اکلوتے مسکراتے ہوئے بیٹے کی طرف بھی نہ دیکھا۔ بچہ باپ کی آہٹ سن کر کھل، اٹھا اور رینگ رینگ کر اس کی طرف بڑھنے لگا۔ مگر "سلمندر" نے نڈھال سر پٹو پر رکھ دیا اور کمر کے بل لیٹ گیا۔

"پنچی" مرہم لے کر قریب آئی۔ جھک کر "سلمندر" کی پشت کو دیکھا۔ وہ سسکی نہ روک سکی۔ کھال جگہ جگہ سے پھٹ رہی تھی۔ چھلے ہوئے چمڑے سے خون رس رہا تھا۔ جسم گرم تھا۔ بخار سے پھنک رہا تھا۔

"پتھر اٹھاتے اٹھاتے تم نے اپنا یہ حال کر لیا اور اف تک نہ کی۔ مرنا تو یوں بھی ہے تو مرنے سے پہلے ایک آدھ پتھر اس تھم کے سر پر مار کر مرو تو جب جانوں۔ یہ تگڑا جسم، یہ طاقت یہ زور، اور اس ظلم کی نذر، یوں خاموشی سے کیے دے رہے ہو! تھم ہمیں مارنا چاہتا ہے، تم قطرہ، قطرہ کر کے اپنی جان اس کے حوالے کیے دے رہے ہو۔ تم سے تو میرا بیل ہی اچھا ہے تھک جائے تو ایک قدم آگے نہیں بڑھاتا۔ لاکھ زور لگاؤ ایک نہیں مانتا۔ اور اگر زیادہ غضب ناک ہو تو جتا بھاگ کھڑا ہوا، اس کا بھی مزاج دیکھ کر کام لینا پڑتا ہے، تم نگری مرد تو بیلوں سے بھی بدتر ہو جبھی تمہیں ایسا تھم ملا۔

سلمندر تھکاوٹ سے چور سر ڈالے پنجی کی باتیں سنتا رہا، ٹھیک ہی تو کہتی ہے، اس نے سوچا،

پنجی نے آہستہ، آہستہ سلمندر کے مرہم لگایا، پھر ہولے، ہولے اس کا بدن دبایا، جب تک وہ گہری نیند سو نہیں گیا، وہ اسے دباتی اور سہلاتی رہی، پنجی تمام رات بے چین رہی، ایک طرف تھکا ماندہ سلمندر سو رہا تھا۔ بخار میں پھنکتا بدن لیے، اور دوسرے طرف اس کا بچہ سینے سے لگا، سوتے میں اس کا دودھ چوس رہا تھا۔ کمرے کی فضا کی سیاہی، چولہے میں جلتی لکڑیوں کی لپکتی روشنی میں کپکپا تی مختلف چیزوں کو عیاں کرتی جاتی تھی۔ کمرے کی چھت کالی تھی، دیواروں پر ٹنگی چھتیوں پر استعمال کے چند سادہ برتن اور کچھ پتھر اور لکڑی کے اوزار تھے۔ ایک طرف لکڑی کی ڈولی نما چھوٹی سی الماری رکھی تھی، جس میں غالباً چند کپڑے رکھے تھے، کمرے کے درمیان ذرا سے اونچے تھڑے پر پٹوؤں کی تہہ جمی تھی، اسی پر سلمندر، پنجی، اور ان کا بچہ سو رہے تھے۔ فالتو پٹو تہہ کر کے تکیہ کے طور پر استعمال ہو رہے تھے۔ تھڑے کے وسط میں ستون تھا، جس پر مختلف مشکیزے ٹنگے تھے، جن میں گھی، انگوروں کی شراب اور مارخور کی چربی تھی۔ کمرے کے کونے میں چمڑے کے چند تھیلے دھرے تھے، ان میں خشک پھل اور خوبانیاں تھیں۔ یہ تھا ان کا اثاثہ، اور یہی تھی پنجی کی ساری کائنات۔ یہ کائنات لرزتی روشنی میں پنجی کے اپنے دل کی طرح لرز رہی تھی..... بیسنگ گری! تو غرق ہو، تجھے کوئی بلا لے جائے۔ زمین پھٹے اور تو اس میں دھنس جائے! پنجی کے دکھے دل سے فریاد نکلی۔

اس دن نگرے کے ہر گھر میں ایک پنجی دکھتا دل لیے بیسنگ گری کو بد عا دے رہی تھی۔ ان کے مرد تھکے ہارے، زخمی بدن لیے اپنی عورتوں کے پہلوؤں میں سو رہے تھے

۔تا کہ کچھ جان واپس آئے تو صبح ہوتے ہی بیگار پر جت سکیں،نہر پر کام جاری رہا ۔گوڑیال سے پتھر آتے رہے ۔شلت کی اعلیٰ مٹی اکھٹی کی جاتی رہی،اس طرح کچھ عرصہ اور گزر گیا۔

سمندر نے اپنے آگے پڑے بھنے گوشت کو دیکھا،دودھ کے پیالے پر نظر ڈالی،ٹوکری میں سجی خوبانیوں کا جائزہ لیا۔اس نے سوچا ہمارا خوف ہماری غلامی ہے ۔ہمارا خوف تھم کی طاقت ہے ۔اس کی طاقت جس نے ہمیں آج اس حال تک پہنچا رکھا ہے ۔یہ خوف تو ایک روحانی بیماری ہے،جب روح بیمار ہے تو خوبانیاں کھا،کھا کر اپنے جسم کو زندہ رکھنے کا کیا فائدہ؟ بیمار روح کا تندرست جسم محض ایک مظلوم ہی بن سکتا ہے ۔اور مظلوم کی زندگی مصیبت ہے،میں تندرست رہا تو کیا،بیگار ہی کاٹوں گا ۔سخت ترین بیگار ۔ظالم تھم کے ہاتھوں،اور اس کے علاوہ اور کر ہی کیا سکوں گا۔اپنے کھیتوں کے بنے باندھنا تو میرے اختیار میں نہیں ۔یہ دوسری فصل کاٹی جا چکی ہے ۔اوپر کی کھیت اگر اس سال بھی یوں ہی رہے،تو اب کے برف باری میں بہہ کر نیچے کھڈ سے جا ملیں گے،پھر نہ زمین ہوگی نہ خوراک ۔روح تو ہے ہی بیمار۔جسم بھی بھوک کے ہاتھوں ختہ ہو جائے گا۔تھم کا کیا جائے گا،ایک غلام نہ سہی،اور جو بہت سے ہیں ۔پھر ہم نہ رہے تو ہماری اولاد جو ہے ۔

سلمندر نے کچھ بھی نہ کھایا،پنجی اداس سی اسے دیکھتی رہی ۔سلمندر کے چہرے پر سوچ کی گہری لکیریں تھیں ۔وہ تھکے کاندھے جھکائے،گردن نیچی کیے،فکرمند نظروں سے زمین کو گھورے جا رہا تھا ۔پنجی نے اس کے خوبصورت توانا بدن کو دیکھا،یہ آہستہ،آہستہ ڈھل جائے گا۔اس نے کرب سے سوچا،کڑی مشقت اپنا اثر دکھا رہی ہے ۔

نہ آرام ہے نہ فائدہ، اتنا کام تو سلمندر نے اپنے پالتو جانوروں سے بھی نہ لیا تھا، چند سال بعد شاید یہ سلمندر بھی نہ رہے۔ پنجی کے دل میں غم کی لہر اٹھی،

تھوڑا سا کھالو۔ اس نے دھیمے سے کہا۔

سلمندر نے چونک کر نگاہ اٹھائی، پنجی کو خالی، خالی نظروں سے دیکھا، یوں جیسے کوئی دور کی بات سوچ رہا ہو۔ پھر وہ یکدم کھڑا ہوا، کرتا پہنے بغیر، ننگا دھڑ لیے، چادر کاندھے پر رکھ کر وہ سامنے کے کھیت سے گزرتا، اٹ پھلانگ کر ڈھلوان پر غائب ہو گیا۔

پنجی گھبرا اٹھی سلمندر کو کیا ہو رہا ہے، یہ کھوئی، کھوئی، ویران آنکھیں، کھانا پینا چھوٹ رہا ہے۔ بات کم کرتا ہے، اور پیار کرنا تو جیسے بھول ہی گیا ہو۔ میں اس کی گویا کچھ نہیں لگتی۔ کوئی بدروح تو اس پر سوار نہیں ہو گئی۔

اس شام پنجی نے سروز کی ٹہنیاں اپنے گھر میں، اپنے آنگن میں، اپنے کھیتوں میں سلگائیں، ان کا دھواں اپنے اکلوتے کمرے کی فضا میں سے گزارا، سلگتی دھوئیں کی دھاریاں چھوڑتی ٹہنیوں کو سارے آنگن میں سے گزارا، اور کھیتوں میں پھرایا۔

دوسری صبح وہ پاک صاف ہو کر سروز کے درخت کے پاس گئی، وہاں آگ جلائی۔ اپنی قمیض اٹھا کر آگ پر رکھی۔ آگ کی آنچ اور سلگتی ٹہنیوں کے دھوئیں کو پیٹ کے ساتھ مس ہو جانے دیا۔

سلمندر کی خیر ہو۔ میرا گھر آباد رہے، بو بو میری مدد کرنا۔ میں بہت فکرمند ہوں، پنجی نے دعا کی۔

تھم کی ہوس ہر گھر کو ہراساں کئے ہوئے تھی، ایک پنچی ہی کیا، سب عورتیں حواس باختہ ہو رہی تھیں۔وہ اکثر سروز سلگاتیں۔اس کے درخت تلے آگ جلاتیں۔نذریں دی جاتیں۔ہر کوئی اپنے بھائی، اپنے بیٹے، اپنے شوہر، اپنے باپ کے لئے پریشان تھی۔

سلمندر آج پھر گھر نہ آیا تھا۔باہر گھپ اندھیری رات تھی، اسی رات کا اندھیرا جیسے آہستہ، آہستہ پنچی کے دل میں بھی سرایت کر گیا۔وہ بنا چراغ جلائے، بنا پلکیں جھپکائے دھک، دھک سا دل لیے خالی ذہن اور ویران وجود سنبھالے، رات بھر جاگتی ہی رہی۔سلمندر نڈھال ہو کر وہیں کہیں کھلے آسمان تلے پڑ رہا ہوگا، پھر ایک دن ایسا سوئے گا کہ شاید پھر اٹھ ہی نہ سکے۔پنچی نے بے تاب ہو کر سوچا، وہ اور کر بھی کیا سکتی تھی؟

صبح نے اپنی چنری ہلائی، رات اپنی سیاہ چادر سنبھالتی، آہستہ، آہستہ فضا سے رخصت ہو رہی تھی۔تارے ماند پڑنے لگے، افق کے مشرقی کونے سے سحر کی سفید یزار روشن تر ہوئی، پہاروں کی چوٹیوں کا رنگ بدل گیا، فضا بیدار ہونے لگی، ہوا ہلکے جھونکوں سے، درختوں، پتوں جھاڑیوں، فصلوں، ننھے منے پھولوں، اور گھاس کے نرم تنکوں کو سہلا، سہلا کر جگانے لگی۔زندگی دھیرے، دھیرے نگر میں داخل ہو رہی تھی۔شفق کی سرخی میں سے سورج کا تھال ابھرا، مشرق کا پہاڑ سونے میں ڈھل گیا۔درختوں پر سجے خوبانیوں کے پھولوں کا رنگ نکھر گیا۔اُن پر ٹکی شبنم کی کنیاں دہک اٹھیں۔

پنچی رت جگے سے چور بدن کو گھسیٹ کر اٹھی، کواڑ کھولے، دالان میں آن کھڑی ہوئی، اس نے اپنے سامنے بکھرے نگر پر اداس نظر ڈالی، فضا پرندوں کی چہچہاہٹ سے گونج رہی تھی۔خوبانی کے درخت خوبانی سے لدے تھے، گیلی فصلیں اور اجلی سبز

گھاس، کھیتوں کے سبز بنوں سے سر اٹھائے ہلکے، ہلکے جھول رہی تھی ۔ اسے فضا شگفتہ لگی، آج جیکا مائی جو تھی۔

وہ کھڑی نگر کو دیکھتی رہی، پھر جا بجا بکھرے گھروں کی چمنیوں سے دھواں اٹھنے لگا، پرندوں کا شوروغل بھی کم ہوتا ہوا خاموش ہوگیا۔

لوگ کچی کچالی بنانے میں مصروف ہو چکے تھے، نہ جانے میر اسلمندر کب گھر آئے گا، پنجی ن یسامنے کی خالی راہداری کو تھکی، تھکی نظروں سے دیکھا۔ میں بھی اندر نہ جاؤں گی، کام نہ شروع کروں گی۔ فٹی کے لئے سامان نہ تیار کروں گی، خواہ شیکا مائی کے بغیر ہی دن ڈھل جائے، سلمندر نہ آیا تو میں کچھ نہ کروں گی۔

پنجی کی آنکھیں بھیگ گئیں، اس نے اپنے آگے بکھری گھاس کو دیکھا، سبز تنکوں پر ٹکے شبنمی ہیرے پنجی کے آنسوؤں کی طرح دمک رہے تھے۔ گھاس کے آنسو ..... پنجی کے ہیرے..... اس نے انگلی کی پوریوں سے آنکھیں صاف کیں۔ کھڑے، کھڑے تھک کر بدن کے وزن کو دوسرے پاؤں پر ڈالا۔ اس کے آگے اگی گھاس کے ہیرے ٹوٹ گرے۔ پنجی نے انہیں دیکھا۔

ہماری بے ہمتی پر قدرت بھی رو رہی ہے۔ ہم اپنے آپ کو مرنے دے رہے ہیں اور کچھ نہیں کرتے۔ یہ بازو پتھر تو اٹھا سکتے ہیں۔ مگر اپنا دفاع نہیں کر سکتے پنجی کے دل میں غم وغصے کی لہر پھر بیدار ہوئی۔

اسی دم سلمندر تھکا ماندہ، جھولتا ہوا، راہداری پر قدم گھسیٹتا نظر آیا۔ پنجی دوڑ کر اس کے پاس جا پہنچی، وہ کیا بولتی، کیا کہتی، سلمندر کی آنکھوں تک میں کوئی سکت نہ تھی۔

تم میرے پیچھے آجایا کرو، پنجی۔ میں نہ آسکوں تو تم چلی آیا کرو۔ آنے جانے میں جو

طاقت صرف ہوتی ہے اب تو وہ بھی نہیں رہی ۔کیچی کچالی تیار ہے، نہیں تو کچھ بھی کھانے کو دے دو ۔

سلمندر سر جھکائے کہتا گیا، پھر گھر کے دالان سے گزر کر اکلوتے کمرے میں جا گھسا، اور اپنے خوابیدہ بیٹے کے پہلو میں لیٹتے ہی گہری نیند سو گیا۔

پنچی نے برتن نکالے چولھا جلایا ۔فٹی کا سامان تیار کیا، کیچی کچالی بنائی ۔ایک بیٹے کے لیئے ، ایک سلمندر کے لئے اور ایک اپنے لئے، جب پک گئی تو اسے تنور سے باہر نکالا ، اور اس پر گھی کے چند قطرے ڈالے ۔لکڑی کے تھال میں سجایا، دودھ گرم کیا، پھل اور میوہ نکالا ۔اور سلمندر کے جاگنے کی منتظر بیٹھ گئی ۔

آج شیکا مائی تھا، غسل کر کے عمدہ کپڑے پہننے کا دن تھا، گھر کو سجانے کا موقع تھا ۔گاؤں والوں کے گھر فٹی لے جانے کی رسم تھی ۔ماں باپ کو جا ملنے کا دن تھا ۔کیچی کچالی کھانے اور کھلانے کا دن تھا ۔مگر نگر کی عورتیں بمشکل اپنے چولھے جلا کر اپنے مردوں کی دیکھ بھال ہی کر سکیں ۔یہ کیسی شیکا مائی تھی ۔ان کی خوشیاں بھی بیسنگ گری کی نہر چوس گئی تھی ۔

پنچی کا بچہ کبھی کا فٹی کھا کر باہر جا چکا تھا ۔وہ بھوکی بیٹھی سلمندر کا انتظار کرتی رہی ۔جب دن کے دو پہر ڈھل گئے تو سلمندر اٹھا، اس کا بدن درد سے چور ہو رہا تھا ۔پشت کے زخم بدتر حالت میں تھے ۔اس نے بنا منہ دھوئے فٹی یوں کھائی جیسے تنور کی موٹی روٹی ہو ۔تھکاوٹ اور بھوک کے امتزاج نے اس سے ذائقہ کی حس چھین لی تھی ۔پنچی اسے کھاتا دیکھتی رہی ۔پھر اسے گرم، گرم دودھ دیا، انگوروں کی گرم شراب دی ۔اس کی قمیض اتاری، پشت صاف کی، اخروٹ کی گریوں کو جلا کر ان پر لگایا

۔سیاہ ہاتھ دھوئے ۔تب کہیں خود کھانے بیٹھی ۔اس رات سلمندر سلگتی لکڑیوں کی روشنی میں اپنے بچے کو سینے سے چپکائے،پنجی کے زانوؤں پر سر رکھے خاموش لیٹا رہا ۔

میں مر گیا تو بیسنگ گری میرے بیٹے کو بھی یوں ہی جوت لے گا۔اس کے دل میں بار،بار یہ خیال سر اٹھا رہا تھا،

ہم نہیں مریں گے،ایک ارادہ کی لہر اٹھی،اور وہ سر جھٹک کر اٹھ بیٹھا۔

کیا ہوا سلمندر؟ پنجی نے گھبرا کر پوچھا؟

ہر چیز کا علاج ہو سکتا ہے،اور اس بیسنگ گری کا بھی ۔اگر وہ ظالم ہے تو ہم بھی انسان ہیں،ہمارے ساتھ بھی قدرت ہے۔

اس رات پنجی اور سلمندر رات گئے تک سر گوشیوں میں باتیں کرتے رہے،ان کا بیٹا بے فکر گہری نیند سوتا رہا ہے۔

ہر کوئی اپنے درد کا درماں ڈھونڈتا ہے ۔کوئی کسی طرح اور کوئی کسی طرح ۔کچھ لوگ اپنے درماں کی تلاش میں اتنے کھو جاتے ہیں،کہ اپنوں سے بھی بے پرواہ ہو جاتے ہیں ۔اپنے ہی درد کا کانٹا نکالنے میں اتنے محو ہو جاتے ہیں،کہ اپنے درد کے ہاتھوں اپنوں کو ہی دکھ دے بیٹھتے ہیں۔

کچھ لوگ درد سے بے قرار جب تڑپتے ہیں تو اپنوں کے درد کو بھی جان جاتے ہیں اپنی تڑپ سے ان کی کسک کا احساس لے کر جب قریب آتے ہیں،تو ایک دوسرے کا درماں بن جاتے ہیں۔

خوش قسمت ہوتے ہیں ایسے لوگ،،،،پنچی اور سلمندر بھی ایسے ہی لوگوں مین سے تھے۔اس کس مپرسی میں جو یہ دولت ان کے ہاتھ لگی،تو انہوں نے سنوار،سنوار کر اسے استعمال کیا۔اس سے کیف پایا اور اسی کیف میں سارے نگر کو رنگ دیا۔

تھکے ہارے بدن،پشت پر اترتی کھال،کانپتی پنڈلیاں اور دکھے ہاتھوں کو سنبھالتے ،وہ ایک دوسرے کو سہارا دیتے۔بوڑھوں کے وزن جوان فوراً اٹھا لیتے۔

بچے دوڑ،دوڑ کر پتھر کمر سے اتارنے میں مدد دیتے۔عورتیں جلدی گھروں کے کام سے فارغ ہو کر ٹولیاں بنا کر مردوں کی راہ پر جا پہنچتیں۔اوران کے پتھر اٹھا لیتیں۔

اس طرح ان کی کمر کو آرام مل جاتا۔

وہ اپنے گھر،بار،سینا،پرونا،مویشی،صفائی ہر چیز کو پس پشت ڈال چکی تھیں۔ان کے مردوں کی جان ہیسنگ گری کھینچ رہا تھا۔وہ بے حال تھے،ان کو کسی صورت بچانا تھا۔

کوئی راہ نکالنا تھی،ان کی مدد کرنا تھی۔یہی خیال ان کے سارے وجود کی توجہ کا مرکز تھا۔

اس شام جب سارا نگر خاموش تھا،درخت نیم خوابی میں جھکیقدرت سے ہم آہنگ سانس لے رہے تھے۔فضا چپ چاپ چاند کی دودھیا روشنی میں اس دھندلے منظر کو دیکھنے لگی۔راہ پر پڑے پتھر،اور چھوٹی لمبی گھاس نے اپنی پشت پر جب بڑے چھوٹے ہلکے،بھاری،قدموں کا بوجھ محسوس کیا تو وہ خبردار ہو گئے۔زمین دبے قدموں کی آہٹ سے جاگ اٹھی۔پگڈنڈیوں کے کنارے،اُگی جھاڑیوں سے جب بدن ٹکرائے تو وہ بیدار ہو گئیں۔

یہ سارے نگری کہاں جا رہے ہیں، انھوں نے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کیں، ہر گھر کے کواڑ دھیرے سے کھلے، نگری مرد، عورتیں، بچے، اپنے اپنے گھروں سے نکلے، اور تھکے ماندے قدموں کو گھسیٹتے سروز کے گرد اکٹھا ہونا شروع ہو گئے۔

رات کا ایک پہر گزر چکا تھا، بیسنگ گری سو رہا تھا، اس کی محل میں سناٹا تھا، اُس کے حواری بھی گہری نیند کے مزے لے رہے تھے۔ چند برسوں سے نہر پر کام ہو رہا تھا۔ اور اس عرصے میں تھوڑا بہت مزاحمت کا جذبہ بھی دم توڑ چکا تھا۔ نگریوں کے کمزور اور خائف وجود بیسنگ گری کو پہلے سے بھی زیادہ طاقتور بنا چکے تھے۔ اسی طاقت کے اعتماد میں وہ اور اس کے حواری بے خبری کی نیند سو رہے تھے۔

انا جب پھولتی ہے تو انا پرست کو کیسے، کیسے جُل دے جاتی ہے۔

سروز کے گرد اونچے نیچے راستوں اور چھوٹے بڑے ٹیلوں پر سارے اکھٹے ہو چکے تھے۔ معصوم بچوں کو ماؤں نے اپنی چھاتیوں سے لگا رکھا تھا، مبادا، رو نہ پڑیں۔ سلمندران سے مخاطب تھا:

بیسنگ گری اندھا ہو چکا ہے۔ اس کا دل گوڑیال سے بھی زیادہ سخت ہے، اس کی اطاعت کا انجام اب تو بچوں کو بھی نظر آ رہا تھا، ہم ان حالات میں چند سال اور کاٹ سکیں گے، پھر ہماری تعداد بہت کم رہ جائے گی۔ ہمارے بعد ہمارے نوعمر بچوں کو جوت لیا جائے گا، پر نہر کبھی نہ بنے گی، اور نہ ہی بن سکتی ہے۔ بیسنگ گری اسے اپنی انا کا سوال بنا بیٹھا ہے۔ وہ ہم سب کو فنا کر دے گا۔ مگر نہر پر کام نہ روکے گا، اب ضروری ہو گیا ہے، کہ ہم اپنا بچاؤ کرنے کی کوشش کریں، یہی ہو گا نا، کہ جان جائے گی، تو جان تو یوں بھی جا رہی ہے۔ اس طرح شاید ہماری اولادیں، اس ظلم سے

آزاد ہو جائیں۔

پینگ گری کو انہی پتھروں سے سنگسار کر دو، جنہیں ڈھوتے، ڈھوتے میرے دادا مر گئے، سلمندر کے چار سالہ لڑکے کی پر اعتماد آواز ابھری۔ اسے سارے نگریوں نے سنا، سلمندر کے پہلو میں کھڑا اینچی کا بیٹا یہ کیا کہہ گیا:

یہ آواز سب کے دل میں اتر گئی، سب نے اتفاق کیا۔

یہ پتھر بینگ گری کے سر پر ہی پڑیں گے۔ انہوں نے مصمم ارادہ کر لیا۔ پھر سب عورتوں نے سروز کے سامنے آگ جلائی، باری، باری اپنی قمیصیں اٹھا کر بدن کو آنچ سے سینکا، اور دھوئیں سے مس کیا، سن نے مل کر دعا کی۔ بو یو ہماری مدد کرنا۔

رات کا دوسرا پہر ختم ہو چکا تھا کہ فضا نے نگریوں کو چپکے، چپکے اپنے، اپنے گھروں کو واپس جاتے دیکھا۔ ان کے پر اعتماد قدم اور پشتوں میں تناؤ ان کے ارادے کی قوت کا پتہ دے رہے تھے۔

پھر اگلے دن وہ پتھر ہی اکھٹے کرتے رہے۔ انھوں نے انہیں نہر پر نہ لگایا۔ نہر کھودنے اور اس کی حد بندی کا کام جو نگری کر رہے تھے، وہ بھی پتھر ڈھونے پر لگ گئے۔ جو شلت سے مٹی لا رہے تھے، وہ بھی پتھر لانے میں جت گئے، انھیں توڑ کر اور چھوٹا کیا گیا، ان کے ڈھیر ذرا، ذرا فاصلے پر لگائے جانے لگے۔ کام پوری توجہ اور انہماک سے ہوتا رہا، بینگ گری اور اس کے حواریوں کو اپنا چابک بہت کم استعمال کرنا پڑا۔ پھر دوسرے دن، بینگ گری نے نہر پر ہوتے ہوئے کام کی تفصیل جاننا چاہی، ایک حواری کو شلت روانہ کیا، شلت کا سارا راستہ ویران تھا۔ نہ کوئی بوڑھا نہ کوئی جوان، اور نہ ہی ان کے آثار۔ یوں لگتا تھا، جیسے سب کہیں غائب ہو گئے

ہوں، آج نگری کہاں چلے گئے ۔حواری نے سوچا،

شلت میں کھدی مٹی کے ڈھیروں کے اردگرد ہرن کے سینگ، کھاریاور ٹوکریاں بکھری پڑی تھیں ۔مگر نگری تو کیا، ان کے قدموں کے نشان بھی نہ تھے، آج شلت کوئی بھی نہ آیا تھا۔حواری نے واپس نگر کارخ کیا۔

دوسرے حواری کو گوژیال روانہ کیا گیا ۔سرسبز وادی، چھوٹی بڑی سلوں سے اٹی خاموشی تھی ،اور نگری نامعلوم کہاں تھے ۔اس نے اردگرد، نگاہ دوڑائی

کوئی بھی نہ تھا، وہ بھی نگر لوٹ آیا۔دونوں نے بیسنگ گری کو مطلع کیا۔

یہ سب کہاں چلے گئے بیسنگ گری کے اندر طیش کھولنے لگا،

کہیں گذشتہ دنوں کے اکھٹے کیے ہوئے پتھر نہر پر تو نہیں باندھ رہے، ایک خیال ابھرا، اس نے نہر کارخ کیا۔کھدی ہوئی نہر آج ویران تھی ۔مٹی کے ڈھیر ادھر، اُدھر لگے ہوئے تھے ۔دن کا پہلا پہر ڈھلنے کو تھا، اور کام تو کیا شروع ہوتا، سلوں کو اکھٹا بھی نہ کیا گیا تھا ۔زیرتعمیر نہر کے آس پاس کی جگہ ہرن کے سینگ بکھرے پڑے تھے ۔ان سے کام لے کر کھودنے والے ہاتھ نہ جانے کہاں تھے ۔

بیسنگ گری کے کشادہ ماتھے پر غصے کی لکیریں ابھر آئیں بھنویں تن گیں، ہاتھ چابک کے گرد ایسے بھنچے کہ انگلیوں کی ہڈیاں سفید ہو گئیں ۔اس نے گھوڑے کی باگ موڑی، اور نہر کے ساتھ گھوڑا بگٹٹ بھگاتا، گل مت کی طرف روانہ ہو گیا،

سورج کی شعاؤں نے اس کی تنی ہوئی غضبناک پشت کو تشویش سے دیکھا،

خوبانی کے پھول چہرہ اٹھائے اسے گھورتے رہے،

بیسنگ گری تھم آج نگریوں پر گر جنے برسنے جا رہا تھا۔

دور سے اس کی قہر بھری آنکھوں نے نگریوں کے ٹولوں، کو ادھر اُدھر، پتھر کے ڈھیر کے پاس بے کار کھڑے دیکھا۔ اُن میں سے کوئی بھی کام نہیں کر رہا تھا، سب ہاتھ لٹکائے یوں کھڑے تھے، جیسے اسی کے منتظر ہوں۔

بیسنگ گری کے طیش میں اور بھی جوش آ گیا، اُس کا گھوڑا تیز تر ہو گیا۔ مگر ابھی وہ کسی ایک نگری کے پاس پوری طرح پہنچنے بھی نہ پایا تھا، ابھی اس کا ہاتھ چابک تھامے اٹھا ہی تھا کہ ایک پتھر فضا میں اڑتا ہوا آیا، اور بیسنگ گری کے کاندھے پر آن لگا۔ اس کا کندھا ایک دم ذرا نیچے کو ہو گیا، اور باگ تھامے بازو جھولی میں جھول سا گیا۔ یوں جیسے ہنسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔

یہ پہلا پتھر سلمندر نے مارا تھا، پھر تو پتھروں کی بارش شروع ہو گئی۔ گھوڑا رکا ایک ساعت کے لئے، پھر سرعت سے مڑا اور بیسنگ گری کو سنبھالے، بجلی کی سی تیزی سے واپس بھاگتا گیا۔

بیسنگ گری سکتے کے عالم میں، ٹیڑھے کندھے سے جھولتا ہاتھ جھولی میں ڈالے گھوڑے پر جما رہا۔ باگیں چھٹ کر گھوڑے کی گردن میں لہرا رہی تھیں۔ دوسرے ہاتھ میں پکڑی چابک ٹاپوں کی زیر و بم کے ساتھ متحرک تھی، اس کی نگاہوں کے آگے وقت تھم سا گیا تھا، ارد گرد سارا نگر، جیسے دور ہوتا ہوا، ساتھ چھوڑتا ہوا پیچھے سرک رہا تھا، وہ کسی چیز کو بھی نہ دیکھ رہا تھا۔ گھوڑے کی بھیانک، تیز رفتاری سے بے پرواہ، سکتے کے عالم میں اسی کی پشت سے چپکا بیٹھا تھا۔

اس کے سامنے نگریوں کے ہزاروں چہرے تھے۔ ان پر پھیلی ہوئی غضبناک آنکھیں

تھیں۔اور ان میں امنڈ تا نفرت وحقارت کا دریا تھا۔

پیسنگ گری نے آج یکلخت اپنی انا کے پرفریب خول سے باہر جھانک لیا تھا،نفرت کا وہ ٹھاٹھیں مارتا دریا خوف بن کر، اس کے شعور کی دیواروں کو توڑ کر اس کے تحت الشعور میں سرعت سے سرایت کرتا جا رہا تھا۔اسی نفرت سے وہ دور بھاگ رہا تھا،اسکے وجود کی ساری قوت اسی رخ پر مڑ چکی تھی۔اسی قوت نے گویا گھوڑے کے سموں میں بجلیاں بھر دی تھیں۔

نفرت کے اس ریلے کے آگے آگے پیسنگ گری اپنے گھوڑے پر سوار پھٹی پھٹی آنکھوں سے نگر کے بدلتے مناظر، میں صرف ایک ہی تصویر دیکھ رہا تھا،نگریوں کی حقارت سے جلتی بے شمار آنکھیں،اور طیش میں اٹھے ہوئے بے شمار ہاتھ۔

اس کے کانوں میں صرف ایک ہی شور مسلسل گونج رہا تھا،

غراتی آوازوں کا شور اور ترڑ،ترڑ گرتے پتھروں کی آواز۔

نگری پتھر اٹھائے اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔دریا کے قریب پہنچ کر بھی گھوڑے کی رفتار میں کمی نہ آئی،پھر نگریوں نے دیکھا کہ گھوڑے نے اپنے سم اٹھائے،ایک بھرپور جست لگائی،اور وہ پیسنگ گری کو اٹھائے ہوا میں بلند ہوا،اور دریا کو پار کر گیا۔دوسرے کنارے پر اس کے سم زمین پر جا لگے۔مگر وہ رکے بغیر اسی تندی سے ہنزہ کی سمت بھاگتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔اس کے سموں کے غبار میں پیسنگ گری کا کندھا لحظہ بھر کے لئے عیاں رہا۔پھر دھول بیٹھ گیا اور پیسنگ گری جیسے ہوا میں تحلیل ہو گیا۔نگری خاموش یہ منظر دیکھتے رہے،ان کی مشترکہ دلیری،ایک ساعت کا متحدہ جوش،اور چند پتھر......بس یہی کافی تھا،پیسنگ گری جیسے ظالم سے نجات

دلانے کو۔

پھر آہستہ، آہستہ وہ متحرک ہوئے، واپس جاتے ہوئے ان کی حالت عجیب تھی ۔کندھے ڈھلکے ہوئے تھے، بازو جھول رہے تھے۔ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔گردنیں جھکی ہوئی تھیں، اور چہرے خوشی سے سرخ ہورہے تھے۔چند برسوں کی ساری تھکان جیسے یکدم ان پر ٹوٹ پڑی تھی۔اور خوشی کی لذت سے مل کر سارے بدن میں میٹھا میٹھا درد بن گئی تھی۔ان کی بیویوں نے گھروں کی چھتوں سے اپنے مردوں کو آتے دیکھا، وہ مسرت سے دمکتیں، قہقہے لگاتیں، کلکاریاں مارتے بچوں سمیت دوڑیں، اور آدھے راستے میں ان سے آن ملیں۔

پھر اپنی عورتوں کے کندھوں کا سہارا لیے، یہ خستہ مرد اپنے، اپنے گھروں کو چل دیے ۔

دریا کے دوسرے کنارے پر اہل ہنزہ اپنے کھیتوں میں کام کررہے تھے، ہنزہ کی فضائیں خاموش اور پرسکون تھیں آسمان صاف تھا تو سہی، مگر زمین کے اوپر جیسے ہلکا سا سایہ ہو۔فضا خاموش تھی، مگر اپنے اندر کسی انجانے قہر کی بھبک لیے تھی، ہنزہ کے لوگوں کو نگر کی طرف سے آنے والے جھونکے فکرمند کیے تھے، وہ کام کرتے، کرتے اس طرف ٹھہر، ٹھہر کر دیکھ لیتے۔

پھر انہوں نے اس پار گردوغبار کے ایک بادل کو لڑھکتے ہوئے تندی سے دریا کی سمت آتے دیکھا، انھوں نے کام چھوڑ دیا، اور متحیر کھڑے ہو گئے، بادل بڑھتے، بڑھتے دریا کے کنارے آن رکا، پھر تحلیل ہونے لگا، تحلیل ہوتے ہوئے اس بادل میں سے ایک گھوڑا نمایاں ہوا۔یہ گھوڑا اپنی پشت پر اپنے سوار کو اٹھائے ہوئے ہوا میں سے

بجلی کی طرح کوندتا دریا کو عبور کرتا، ہنزہ کے ساحل پر آن لگا، اہل ہنزہ نے دیکھا کہ گھوڑے کے نتھنوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔اس کے پٹھے کسی غیر مرئی قوت کے بھر جانے سے کھنچے ہوئے تھے۔گردن تنی تھی، سموں میں گویا بجلیاں بھری تھیں، اس پر بیسنگ گری سوار تھا۔

یہ سب انہیں لحظہ بھر کے لئے نظر آیا، پھر وہ گھوڑا انتہائی تیزی سیاہل ہنزہ کے حیران چہروں سے بے پرواہ انہی کی فصلوں کو روندتا ہوا، بلتیت کی سمت غائب ہو گیا،

اہل بلتیت کام چھوڑ کر پریشان اکھٹے ہو گئے۔جو گھروں کے اندر تھے، باہر نکل آئے۔

بیسنگ پر کیا آفت آن پڑی، کہ وہ دنیا سے بے پرواہ، اپنے گھوڑے پر جما، کہاں کا رخ کیے اڑا جارہا تھا؟ آخر کس سے بھاگ رہا تھا؟ اس سے نگری تو کیا اہل ہنزہ تک خوف کھاتے تھے،،،،،وہ آج کس سے خوف زدہ تھا؟

گھوڑا اموہد کا رخ کیے تھا۔

اہل ہنزہ میں سے کچھ جی دار اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور بیسنگ کے تعاقب میں چل دیے۔

گھوڑا اموہد سے ہوتا ہوا، دو، دونگ،مرکو کی پہاڑی پر چڑھنے لگا، بیسنگ گری اس پر ڈٹا تھا، اور گھوڑا اسے لئے تیزی سے بڑھے چلا جارہا تھا،

ظالم کا زعم کچا شیشہ تھا، جو متحدہ بے خوفی و خود اعتمادی کی ایک ہی ضرب سے چور ہو گیا۔

اس خول سے جو بیسنگ گری باہر نکلا تو اسے اپنا آپ بہت عریاں اور غیر محفوظ و بے آسرا لگا،

اس نے اپنے اندر جھانکا تو وہاں بھی کچھ نہ تھا۔نخوت، تکبر،،،،، ظلم،،،، سب بہہ گئے تھے۔اس کے کھوکھلے باطن میں اب کوئی چیز ایسی نہ تھی، جس سے سہارا پاتا۔جس دیوتا کے نام پر آج تک راج کرتا رہا تھا، جس سے ان گنت حقوق حاصل کر کے وہ فرائض کی پابندیوں سے آزاد، بے دریغ من مانی کرتا چلا آیا تھا۔.....

وہ دیوتا آج یکدم نگریوں کی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔اور اسے قہر بن کر گھور رہا تھا،

ان چند ساعتوں میں بیسنگ گری کی ساری کائنات،،، درہم، برہم ہو چکی تھی۔

جن اصولوں پر ان کی زندگی آج تک قائم تھی۔وہ یکلخت کہیں گم ہو گئی تھی، اور اسی ایک ساعت میں ان اصولوں کے متبادل اصول بیسنگ گری کو گھیرے ہوئے تھے۔ان متبادل اصولوں کو وہ جان تو گیا تھا، مگر انہیں اپنا کیسے لیتا۔انھیں اپنے کھوکھلے اور متزلزل وجود میں کیسے ڈھال لیتا،

آج وہ خائف تھا بے حد خائف۔اس کے اندر کی عمارت گر چکی تھی۔باہر کے سب جانے پہچانے ستون آج اتنے نحیف تھے، کہ اسے کسی سے بھی سہارا نہ مل رہا تھا

ہنزہ کا تھم؟..... نہیں نہیں میری طرح وہ بھی کھوکھلا ہے۔

عزیزوا قارب؟..... نہ، نہ مجھ سے بھی زیادہ نحیف

اپنی رعایا؟..... خوف کا ایک تیز ریلا اٹھا، اور اس کے وجود کو لرزا گیا۔

دو، دونگ، مرکوکی پہاڑی سے ہوتا ہوا اس کا گھوڑا خروپھیری کا رخ کیے بڑھتا گیا۔

آج وہ سارے جواز، رد ہو چکے تھے۔ جن کے بل بوتے پر ہیسنگ گری اب تک زندہ رہا تھا۔ ان کے تضاد اس کے مقابل تنے کھڑے تھے۔

طاقت..... نہیں محبت!

حکومت..... خدمت!

حق؟..... نہیں فرض!

دولت..... مادی؟..... نہیں روحانی!

دیوتا..... ظلم؟..... نہیں احساس!

تھم..... بیگار؟..... نہیں عدل اور رحم!

لوٹنا.....؟ نہیں، دینا

نہر.....؟ نہیں راحت

ان کے چھٹتے ہی سچ کا شفاف آئینہ سامنے آیا۔ اس آئینے میں ہیسنگ گری نے اپنے آلودہ و کثیف وجود کی جھلک دیکھی تو برداشت نہ کرسکا۔

اس جسم اور اس کی بندگی میں میری روح کس قدر کثافت سمیٹ چکی ہے۔ اس نے لرز کر سوچا۔

خرور پھری پہنچ کر ہیسنگ گری رک گیا، وہ آہستہ سے گھوڑے سے اترا، اور اپنی

چابک کچھ اس انداز سے زمین میں گاڑی،، جیسے ظلم کی لاٹھی کو ہمیشہ کے لئے علیحدہ کر رہا ہو۔

مگر وجود کی سب آلائشوں کو ختم کرنا تھا۔انہیں جان لینے کے بعد ان میں بسے سانس وہ کیوں کر لے سکتا تھا۔مگر اس کا وجود تو کل انھیں آلائشوں کا مرقع تھا۔اسے آج اپنے ہی آپ سے پناہ چاہیے تھی۔

ییسنگ گری نے گھوڑے کی باگ تھام کر خرورپھری کی زمین کو ایک لاوارث کی سی بے بسی سے دیکھا۔

زمین آہستہ،آہستہ ہلنے لگی ۔اس کے ذرات ایک دوسرے سے دور ہوتے ہوئے ہلکورے لینے لگے اور بہنے لگے ۔وہ خاک کا دریا ہو گئے ۔ییسنگ گری نے گھوڑے کی باگ چھوڑی،اور دریا میں قدم رکھا۔گھوڑا نتھنے اٹھائے،مالک کی بو سونگھتا ہوا ۔اس کی پیچھے دریا میں اتر گیا۔مٹی کی لہروں نے آہستہ،آہستہ دونوں کو نگل لیا۔کچھ دیر بعد زمین پھر اپنی اصلی حالت میں آگئی ۔پھر اس میں سے شفاف اور میٹھے پانی کا چشمہ پھوٹ نکلا۔

خرورپھری میں یہ چشمہ آج بھی موجود ہے ۔اسے ییسنگ گری کا چشمہ کہتے ہیں،اس کی چابک سے بانس پھوٹ آئے تھے ۔یہ اب بھی موجود ہیں۔

گل مت کی چٹانوں پر اس نامکمل نہر کے بچے ،کھچے ،آثار اب بھی نظر آتے ہیں۔جو ایک ظالم نے اپنی رعایا کی مرضی کے بغیر انہی کے وسائل کو استعمال کر کے بہ جبر تعمیر کرنے کی کوشش کی تھی۔

(۱)شیکا مائی ۔ایک مقامی تہوار کو کہتے ہیں، جو خوبانی کے پھول کھلنے پر منایا جاتا ہے ۔اس کا رواج اب ختم ہو چکا ہے۔

(۲)فتی ۔ایک مقامی کیک کی طرح کی روٹی کو کہتے ہیں۔

(۳)سیروز(juni per)کے درخت کو کہتے ہیں ۔اسے مقدس سمجھا جاتا ہے۔

(۴)بویو(boyo)(باوی)سروز میں کچھ نیچر سپرٹ رہتی ہیں، جو لوگوں کی مدد کرتی ہیں، قدیم زمانہ میں ان کی پوجا کی جاتی تھی ۔نظر اتارنے کے لئے اور آفت اور بلاؤں سے تحفظ کے لیے سروز کی ٹہنیوں کے دھویں کو گھر سے گزرا جاتا تھا۔

(۵) سلمندر اور پنچی ۔قدیم زمانے میں پنچی کا مطلب چھوٹا سا حفاظتی قلعہ تھا، سلمندر ایک رواتی پرندے کو کہتے ہیں، جو ہزار سال تک زندہ رہتا ہے ۔ہزار سال میں ایک انڈا دیتا ہے ۔پھر اپنی ہی اکھٹی کی ہوئی لکڑیوں کی آگ میں جل کر مر جاتا ہے ۔اس کی خاک میں سے اس کا انڈا برآمد ہوتا ہے، جو دوسرے سلمندر کو جنم دیتا ہے ۔اسی قسم کے ایک پرندے کا نام ہندوؤں کی روایت کے میں موسیقار یا دیپک لاتا کے نام سے مشہور ہے ۔اس کا ذکر ویدوں میں بھی ہے ۔مقامی لوگ اس نام کو مرد اور عورت کے ناموں کے لئے استعمال کرتے تھے۔

(۶)تھم ۔مقامی راجہ کو کہتے ہیں۔

خامر اور خورو

گلگت کی وادی سے ہٹ کر سڑک بتدریج بلند ہوتی جاتی ہے،نومل میں چند درخت اور سر سبز جھاڑیاں نظر آتی ہیں ۔،پھر سارا راستہ بنجر اور ویران پہاڑی ۔سنگلاخ چٹانوں،خاکستری پتھروں،اور بُھر بھری ریت سے اٹا ہوا بڑھتا چلا جاتا ہے ۔دریا ہے تو سہی مگر تنگ ہوتی ہوئی گھائی میں زور شور سے بہتا ہے۔اس کی جوشیلی موجوں میں اس قدر طلاطم ہے، کہ اگر ایک فوجی ٹینک بیچ میں ڈال دیا جائے تو یہ اس طرح ٹوٹ پھوٹ جائے گا، جیسے کچے ٹین کا ہو

دریا کا پانی گدلا ہے، ایسے ابلتی ہوئی سلیٹی مائع رواں ہو،ایک طرف یہ مائع موجوں کے غضب ناک انداز دکھاتی ہے ۔تیزی سے سڑک کے ساتھ،ساتھ بہتی چلی جاتی ہے ۔اور دوسری طرف خشک نا قابل عبور پہاڑ ہیں ۔جن کا سارا وجود ہی یہ احساس دیتا ہے۔کہ آگے مت جاؤ، تمہارا جانا اچھا نہیں ۔

شاہراہ ریشم بننے سے پہلے اسی سنگین اور تنگ کھائی نے ہنزہ کو پاکستان کے دیگر علاقوں سے الگ رکھا، انگریزوں کے زمانہ عروج میں بھی یہ جدا اور آزاد رہا۔

ہنزہ کی اس زمانہ کی تاریخ نے مسافروں کو کبھی خوش آمدید نہیں کہا،چوٹیوں پر ڈٹے اس کے چوکیدار اس تاک میں رہتے تھے،اور آنے والے کو قریب پہنچنے سے قبل ہی با آسانی ختم کر دیا جاتا تھا۔

آج جب کہ ہم اسی راستے پر تھے،تو ایسے ہی چند پرانے واقعات ذہن میں ابھر نے لگے ۔دریا کے شور اور گھورتی چٹانوں کے دبدبے سے سبھی خاموش تھے ۔ہر موڑ پر

خطرے کا مبہم سا احساس اٹھتا،مگر سڑک کی کشادگی اسے مٹا دیتی ۔یہی کیفیت رہی،کافی عرصہ خدا جانے کتنے میل طے کر لیے اسی طرح،پھر ایک موڑ مڑے،اتنا تیکھا کہ سوائے پہاڑ کے پردے کے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔اس پردے سے جو باہر نکلے تو یک دم فضا کا انداز بدل گیا۔ہماری کار جیسے رینگنے سی لگی۔کوئی بھی نہ بولا،سبھی دم بخود اپنے سامنے پھیلے ہوئے نظارے کو دیکھ رہے تھے۔

وادی کشادہ ہو رہی تھی۔پہاڑ سڑک چھوڑ کر دور ہٹ رہے تھے،ہٹتے ہوئے یہ پہاڑ اپنے نفیس کھیتوں کو سینے سے آگے بڑھا کر،پھیلا کر یوں پیش کر رہے تھے۔جیسے طشتریاں ہوں۔ان طشتریوں پر زمرد سبزہ تھا،ان کے کناروں سے لٹکتی ہوئی انگور کی بیلیں تھیں۔دائیں،بائیں،ادھر،اُدھر،آگے،پیچھے،انہیں سنگلاخ پہاڑوں سے نکلے ہوئے یہ سرسبز کھیت اپنے حلقے میں خرمانیوں سے لدے ہوئے درخت لیے تھے۔اور تحفہ بہ خوش آمدید کے انداز میں پیش کیے جا رہے تھے۔غضب ناک سلیٹی مائع،کبھی کی گلگت کی طرف بھاگ چکی تھی،اور اب شفاف پانی کا ایک تازہ اور چمکتا ہوا دریا،نیلی موجیں اچھالتا،رواں تھا،دریا کی آواز میں ہنسی تھی۔اس کے جوش میں مستی تھی،کھنکھناتی ہوئی بلوری ندیاں،بلندیوں سے جھرنے بناتی دری اسے آکر مل رہی تھیں۔چشم و دل دونوں سیراب ہو رہے تھے۔

ہم نے کار روک لی،پرندوں کی چہک،پانی کی آواز،سبزے کی سرسراتی موسیقی،پھلوں کی مہک،اور فضا کی مہک میں،ایک کیف تھا۔جو پورے بلتستان میں کسی اور وادی میں اس حد تک میسر نہیں۔.....ہمارے سامنے قدرت اپنے پر محبت اور درخشاں حسن کو بے حجاب کیے کھڑی تھی۔ہم محو دیکھتے رہے۔

اور اب بھی جب کہ تصور اس نظارہ کو دیکھ رہا ہے،اور روح اس کے لطف سے سرشار

ہے، قلم میں وہ مجال نہیں کہ اسے بیان کر سکے، ہنزہ کی دید اور اس کا احساس ایک ایسی واردات ہے، جس سے گزرنا ہی اس کو پانا ہے۔ قلم اس کی پہچان کرنے سے قاصر ہے۔

پھر گاؤں در گاؤں، زمین کے جڑاؤ خطوں میں سے گزرتے، بل کھاتی سڑک پر رواں شفاف، جھرنوں کی موسیقی کا مزہ لیتے نگر سے ہوتے ہوئے ہم ہنزہ پہنچے۔

ہر طرف ہنستے مسکراتے، مرد عورتیں، بچے، توانا اور پر اعتماد چہرے لیے، صاف لباس، کشادہ آنکھوں اور کھلی پیشانی والے حسین لوگ نظر آئے۔

کار رکتی تو یہ ہمیں گھیر لیتے مگر انہیں بہاؤ اور تو کل کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ جو جی چاہے دے دیں، اگر خریدنا ہے تو خرید لیں۔ بیچنے والے اکثر بچے ہوتے، اگر کوئی بڑا ان کے ساتھ آجاتا تو چند باتوں کے بعد وہ مسکرا کر مہمان نوازی کے انداز میں خرمانیاں تحفتہً دے دیتا۔

ایک حقیقت کا انکشاف ہوا، راکاپوشی، جس کا ذکر اکثر سنتے آئے ہیں۔ اور جس کی تصویر پاکستان ٹورنگ کے سفری کتابچوں میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ اسے ہنزہ کا ایک منظر لکھ کر دکھایا جاتا ہے، مگر یہ حسین چوٹی ہنزہ میں ہے ہی نہیں۔

یہ نگر میں واقع ہے، نگر پہلے آتا ہے۔ ہنزہ بعد میں۔ ہنزہ اور نگر دو بھائیوں کی دو ریاستیں ہیں۔ جن میں ایک مدت تک جنگ رہی۔ دریا ان کے بیچ میں رواں ہے۔

ان کے درمیان جنگ کی بھی ایک لمبی اور دلچسپ داستان ہے۔

ہنزہ کی موجودہ با حیات رانی، نگر کے راجہ کی بیٹی ہیں۔ اور اسی رشتے کے بعد ان کی

انتہائی دشمنی اب صلح میں بدل گئی ہے۔

ہنزہ کا دارالحکومت کریم آباد ہے۔ کریم آباد کی دھوپ بہت تیز ہوتی ہے۔ باہر نکلو تو یہاں کی عورتوں کی طرح سر پر ٹوپی پہن لینے میں ہی عافیت نظر آتی ہے، ورنہ سر تپ جاتا ہے اور باقی دن درد سہتے رہیے۔

راستے چوڑے کیے جا چکے ہیں مگر اسی طرح دھول سے اٹے ہوئے ہیں۔ پانی کی نالیاں انہی راستوں کے ساتھ، ساتھ بہتی رہتی ہیں۔ راستوں کے گرد پیڑ ہیں، جو میٹھی شہد خرمانیوں سے لدے، جھکے، سایہ کیے رہتے ہیں۔ زمین پر تو دھول ہے لیکن نہ درختوں پر ہے نہ سبزے پر۔ بس ان گنت گری پڑی خرمانیاں، یا پھر پاؤں اس گرد سے اٹ جاتے ہیں۔ ویسے فضا صاف ستھری رہتی ہے۔

سورج خاموش ہوتے ہی موسم خشک ہو جاتا ہے۔ ہوا اپنے میں راکاپوشی، اُس پر اور ہسپر گلیشر وں سے ہلکی سردی لیے ہوئے سرکنے لگتی ہے۔ یہاں آدمی تازہ دم ہی رہتا ہے، خواہ سارا دن بھاگتا دوڑتا رہے۔ تھکاوٹ محسوس نہیں کرتا۔

میں نے سامنے بلتیت کے سرسبز کھیتوں کو دیکھا، صدیوں پہلے اس ملک کی ایک کہانی تھی۔ جب خام خوروں کو لوٹ لیتے تھے۔ ان کی زمین چھین لیتے تھے۔

انھیں لاچار کر دیتے تھے۔ ہر چیز سے لاچار، خوراک سے۔ لباس سے، سہولتوں سے، وہ دن رات کمر توڑ محنت کے بعد بھی مجبور ہی رہتے تھے۔ وہ روٹی، کپڑا، مکان کے دائرے میں ہی گھسٹتے چلے جاتے تھے۔ اس دائرے سے باہر نکل کر کسی اور سطح پر زندگی گزارنے کا انداز انہیں کبھی میسر نہیں آ سکتا تھا۔ اب جو رستا کھلا تو دیکھا، کہ یہ کتنا ترقی یافتہ معاشرہ ہے؟ اس میں مساوات ہے، انصاف ہے، باہمی تعاون

ہے، ان کی عزت ایک ہے، ان کے گھر صاف ہیں۔ ان کی سڑکیں محفوظ ہیں۔ جرم نام کی کوئی حقیقت نہیں۔ چوری کے ڈر سے اس طرح آزاد ہیں کہ پورے ہنزہ میں کوئی کتا تک نہیں رکھتا۔ اور نہ ہی صدیوں سے کسی نے رکھا ہے۔ ان میں میزان ہے، محنت اور لگن ہے۔ مرد اور عورتیں صبح سے شام تک مل کر کھیتوں میں کام کرتے ہیں۔ اور فراواں خوراک اگاتے ہیں۔ دھوپ ڈھل رہی تھی۔ جب ہم بلتیت کے پرانے محل سے ہوٹل کریم آباد کی طرف روانہ ہوئے، جا بجا لوگ کھیتوں میں مصروف تھے۔ ہر طرف مسکراہٹیں تھیں۔ صاف چہرے تھے، اجلے لباس تھے۔ عورتیں سفید دوپٹے اوڑھے، مردوں کے شانہ بشانہ مصروف تھیں، ان کے انداز میں ایک وقار تھا، جو ان کا سماج انھیں دے چکا تھا، ہر بچہ سکول جاتا ہے سبھی خواندہ ہیں، وہ ایک ستھرا معاشرہ ہے۔ اندر سے صاف باہر سے اجلا، باہمی میل جول میں پاک۔

جی چاہتا ہے کہ ہنزہ کو پاکستان کہوں۔ ہنزہ کو اس نام کا استحقاق حاصل ہے۔ ہوٹل کریم آباد میں ایک سادہ سا ہوٹل ہے۔ ریسٹ ہاؤس (NAWO) میں ہماری بکنگ ہو چکی تھی۔ مگر اس ہوٹل کی انتظامیہ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ وہاں نہ گئے۔ معمولی سے کمرے ہیں اور سادہ غسل خانے۔ گرم پانی بالٹی میں لایا جاتا ہے۔ لوہے کے نواڑی چارپائیاں کھٹملوں سے محفوظ ہیں۔ بستر صاف، چادریں بغیر مطالبہ کیے روزانہ بدل دی جاتی ہیں۔ اُجلے تولیے رکھ دیے جاتے ہیں۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کہیں نظر نہیں آتے۔ مسافر جو گند ڈالتے ہیں وہ اسی دن غائب کر دیا جاتا ہے۔ کھانے کی ایک سادہ سی میز باورچی خانے میں رکھی ہے، جس پر تقریباً دس، بارہ لوگ کھانا کھا سکتے ہیں۔ کھانا مہمانوں کے سامنے ہی پکایا جاتا ہے۔

انتظامیہ تین افراد پر مشتمل تھی۔ تینوں میں نہ کوئی افسر تھا نہ ماتحت۔ ہر کام تینوں مل

جل کر کرتے تھے۔ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے۔ان کا رویہ دوستانہ تھا، تینوں ہی تعلیم یافتہ تھے۔اور اپنے لباس، گفتار میں اجلے تھے۔

کھانے کے بعد ہماری ان سے کافی لمبی گفتگو رہتی۔ہنزہ کی تاریخ۔اس کی قدیم روایتیں، مقامی حالات، سڑک بن جانے کے بعد ان کے سماجی اور سیاسی حالات اور حکومت پاکستان کی طرف سے یہاں جو انتظامی تبدیلیاں لائی گئی ہیں۔۔۔اس قسم کے موضوعات پر سلجھی ہوئی گفتگو ہوتی، جو ایک پڑھا لکھا ذہن ہی کر سکتا ہے۔

باہم زندگی گزارنے کا جو سلیقہ ہنزہ کا چھوٹا معاشرہ سیکھ چکا ہے۔ہم اس سے متاثر رات گئے کمروں کو لوٹ آتے۔

اس رات بھی ایک ایسی ہی لمبی گفتگو ہوئی۔واپس لوٹے تو ذہن کچھ زیادہ ہی متاثر تھا۔کافی دیر خیالات کے تانے بانے بنتے رہے۔کچھ حقائق اور ان کی تلخ یادیں ابھرتی مٹتی رہیں۔۔۔اس رات میں نے عجیب خواب دیکھا، کہ پاکستان کا نقشہ پھیل کر ایک وسیع سمندر بن گیا ہے۔سمندر تاریک ہے، کالے پانی سے مچلتا ہوا اور بے کراں ہے۔کوئی کنارہ نظر نہیں آتا، پھر دیکھا کہ اس عریض و تاریک سمندر کے بیچ ٹمٹماتے ہوئے چند جزیرے روشن ہیں،،،،صرف چند،،،،ان جزیروں کے چہرے ابھرے تو میں نے انھیں پہچان لیا، کراچی...... حیدر آباد .....لاہور ......ملتان..... فیصل آباد.....پھر میں نے کالے سمندر میں مبہم سی قطاروں کو رینگ، رینگ کر بڑھتے محسوس کیا۔یہ قطاریں عمیق تاریکی کے دور دراز کونوں سے رواں ٹوٹتی، پھر ابھرتی، مسلسل روشن جزیروں کی سمت رواں ہیں۔

میں نے دیکھا ان قطاروں کے دوش پر ان گنت، بھوکے، کملائے ہوئے بوسیدہ

لباس میں ملبوس جسم ہیں۔ بچوں کے، جوانوں کے، اور کثرت میں لڑکوں کے، یہ کس کی اولاد ہیں۔

پھر میں نے اندھیرے سمندر سے دبا دبا شور سنا۔ میں نے آہ وزاری میں لہراتی، کلبلاتی، باہیں دیکھیں، پھٹی آستینوں سے لپکتی، محنت سے مجروح ہاتھ لئے، بین کرتی ماوں کی باہیں جوان جزیروں کی طرف بھاگتے ہوئے بیٹوں کو ڈھونڈ رہی ہیں
۔

میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔ وہ شور میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ میں نے کھڑکی کھول دی۔ باہر کی ہلکی تاریکی میں اس کا چہرہ ابھر آیا۔ اس چہرے کے ہونٹ ہلے۔ اور وہ بولی۔ "میرے فیروز کو ڈھونڈ لاو بی بی"

اب کہ میں نے بستر ہی چھوڑ دیا، کمرے سے بھی نکل آئی اور برآمدے میں چہل قدمی شروع کردی۔ مگر اس عورت کا چہرہ ساتھ رہا، اس کے دکھ کا احساس میرے ضمیر پر چوٹ ہے جو سینے تک گہری ہے۔ میں اسے چند سال قبل ملی تھی۔

چھوٹا سا مختصر بدن، جھریوں بھرا ہاتھ، جن پہ رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ وہ کھردری انگلیاں، جن کے جوڑ مشقت کے باعث گانٹھوں کی صورت میں نمایاں تھے۔۔۔

وہ کمزور سی تھی۔ اس کے کالے بالوں میں سفیدی کی دھاریاں تھیں۔ بھووں کے نیچے دھنسی ہوئی دھندلی آنکھیں، زرد رخسار اور ہونٹوں کے آس پاس گہری لکیریں۔

کیا عمر ہوگی اس کی؟ اس نے جو گذاری اسے کیا زندگی کہتے ہیں۔؟؟ یہ بھی رب بھی تحفہ ہے۔ یا پھر ہمارے ضمیر کے لیے کچوکا؟؟؟

میرے فیروز کو ضرور ڈھونڈنا بی بی جی، گھر سے گئے اسے چھٹا سال ہوگیا ہے، کوئی پتہ نہیں اس کا، یہی کوئی بارہ برس کا ہوگا، بھاگ گیا۔ کہتے ہیں، بشام کی بس پر چڑھا تھا۔ اسے ہمارے گاؤں کے آدمیوں نے اس وقت دیکھا، جب بس روانہ ہوچکی تھی۔بس یونہی کھڑکی سے جھلک سی پڑی تھی۔بس جی اس بشرے جتنا تھا۔

اس نے کرب سے بشرے کو دیکھا۔یہ کیوں بھاگ جاتے ہیں؟ میں نے دکھ سے سوچا۔اس نے شاید میری سوچ کو پکڑلیا۔کیا کریں بی بی، یہاں نہ بجلی ہے۔نہ سرک ہے، نہ سکول، باہر سے لوگ آتے ہیں۔سیر کرنے۔کھلا پیسہ لے کر مہنگی مہنگی جیپوں میں، کہتے ہیں کہ ایک جیپ کی قیمت سے گاؤں کا حلیہ بدل سکتا ہے۔میلوں لمبی سڑک، سکول اور ہسپتال بن سکتے ہیں۔نالے سے بجلی پیدا کی جا سکتی ہے۔یہاں تو ہر سال کتنی جیپیں آتی ہیں۔ذرا، ذرا کام کے دس روپے یوں پکڑا دیتے ہیں، جیسے ردی کاغذ کے ہوں۔خدا مارے اس صاحب کو۔فیروز کو ایک سو روپیہ دے دیا ہو گا، اس کا سامان جو چھوڑنے گیا تھا۔تو پھر واپس نہ آیا۔وہیں سے سیدھا بس پکڑی بشام کی اور میرے گھر کو اندھیرا کر گیا۔وہ سسکنے لگی۔پھر بولی ہر سال جب شہر سے لوگ آتے ہیں۔تو میں یہی امید لے کر ان کے پاس آتی ہوں۔شاید کسی نے میرا فیروز دیکھا ہو۔شاید کوئی میرا فیروز ڈھونڈ دے۔

یہ عورت پاکستان کے ان لاتعداد گاؤں میں سے ایک کی مکین ہے۔جن کی پرورش کے لئے ہمارے بجٹ میں ابھی تک کوئی خانہ بنا ہی نہیں۔اسے ملے چند سال ہو چکے ہیں مگر اس کے دکھ میں رچا بسا لمحہ ابھی تک میرے دل میں ساکت ہے۔جب کبھی یہ دل دھڑکتا ہے۔تو اس دکھ کی ایک ضرب ضمیر پر بھی پڑتی ہے۔

یہ ہمارے فیروز، یہ ہمارے خورو، ان پر ظلموں کے تنے ہوئے یہ جال جن کی

ڈوریں ہم خامروں کے ہاتھ میں ہیں۔یہ جال کب ٹوٹیں گے۔

نہیں تو ہم خامروں کا کیا ہوگا؟؟

کل کا خنجراب کا سفر ذہن ودل پر تمام دن حاوی رہا۔کیا خوبصرت سر زمین ہے، ہماری..... ہر چیز ہے ہمارے پاس، اوراس کو استعمال کرنے والے ذہن بھی ۔ہیں ۔مگر ہم سب، ہمارے خوبصورت پہاڑ، ہمارے عمدہ لوگ، ایک ایسے نظام میں جکڑے جا چکے ہیں، جو یہاں کی کسی بھی صلاحیت کو، نہ زمین کے وصف کو، اور نہ ہی ہماری خوبیوں کو بروئے کار آنے دیتا ہے۔

وہ شام بہت ہی ہلکی پھلکی تھی، ماحول میں لطافت تھی۔ہنزہ کی خوشگوار ہوا نے مجھے سہلانا شروع کر دیا۔فضا کے سکون نے آہستہ، آہستہ مجھے گود میں لے لیا۔بادل ہٹ گئے۔اندھیرے سے کالک چھٹنے لگی۔میرے سامنے پوری وادی مدھر چاندنی میں نہائی پڑی تھی۔اُس پر کا پہاڑ چمک رہا تھا۔اسپر کا جھرنے بناتا پانیچاندی کی سی دھاروں میں بہہ رہا تھا۔اوراسپر خودیوں دکھائی دیتا تھا۔جیسے چاندی ہیرے سے جا ملی ہو۔اس پراسی کے ابھاروں کے پڑتے کالے سائے، جیسے قدرت نے چاندیاور ہیرے کے جگمگاتے تھال میں کالے رومال سجادیئے ہوں۔

آسمان صاف تھا، فضا پاکیزہ نور میں نہائی ہوئی تھی۔ساری وادی ایسے نکھری ہوئی تھی، جیسے ہر کوئی جاگ رہا ہو۔درخت، خرمانیاں، فصلیں، گھاس، پتھر، سبھی زندہ تھے۔اورزمین کے سینے سے چمٹے، اپنی ماں سے محبت اور تحفظ کی دولت سمیٹے سانس لے رہے تھے، پریاں ایسی ہی جگہوں پر آتی ہیں۔ہر ذی روح ایسے ہی مقامات پر آزاد پھرتا ہے۔مسرور فضائیں خدا کے نام کی تسبیح کرتیں ہیں، اوراگر ہلکے سے کسی

پھول، کسی جھاڑی، کسی پتے سے بات کرو،تو وہ بھی جواب دے دیتے ہیں ۔گزرے واقعات کی داستان سنا دیتے ہیں۔محبت کا سبق پڑھا دیتے ہیں۔دل میں رس گھلتا ہے،انسان کی روح جسم سے باہر بہنے لگتی ہے ۔فضا کی وسعتوں میں گھل مل جاتی ہے ۔یوں پھیلتی ہے، کہ سارا جہان اپنا ہو جاتا ہے ۔معجزوں پر یقین کیوں نہ آئے،انسان ایسے لمحات میں از خود اعجاز ہوتا ہے۔

خامر نے خورو سے کیا کہا؟میرے تجسس سے سوال ابھرا۔

میرے سامنے بلتیت کے کھیتوں کا انداز بدل گیا۔ایک کچا سا گھر بن گیا۔جس کا آنگن کھیتوں سے اونچا تھا،آنگن تک پہنچنے کے لئے لکڑی کے ڈنڈوں کو جوڑ کر ایک سیڑھی بنا رکھی تھی۔کھیت نیچے تھے۔اور آنگن اونچا،اور آنگن سے بھی اونچا گھر،جس کی نیچی دیواروں سے بیلیں لٹک کر کھیتوں پر آ رہی تھیں۔

صحن میں کھڑا خورو،اپنے سامنے بیٹھے بیٹے کی بات غور سے سن رہا تھا۔

بابا آپ کو خامر چچا سے بات کرنی ہوگی۔لحاظ سے کام نہ چلے گا،آپ کا حصہ ہے لیجئیے۔گاؤں کے بڑوں کو بیچ میں ڈالیے۔آخر رہنا تو خامر کو یہیں ہے۔اور پھر صدیوں پرانی رسم کو کیسے توڑ سکتا ہے۔میرے دادو فات پا چکے ہیں۔زمین کی بٹائی ہو کر رہے گی۔اور انصاف سے ہوگی۔

ہاں بیٹا میں خامر سے کل ضرور بات کروں گا،خورو نے استقلال سے کہا،تمہاری ضرورت نہیں،میرا اور میرے بھائی کا معاملہ ہے۔وہ ضرور سنے گا۔

اس شام خورو دیر تک سوچتا رہا۔بابا کو فوت ہوئے کافی عرصہ گزر گیا۔

پچھلی فصلیں بھی خامر نے خود ہی لگوائیں اور خود ہی اٹھائیں، کام کا سارا بوجھ مجھ پر اور میرے اکلوتے بیٹے پر رہا۔ خامر اور اس کے سات بیٹے فصل اٹھاتے وقتیوں دندناتے پھر رہے تھے، جیسے ساری زمین صرف ان کی ہو۔ ہمارا کوئی حصہ اور دخل نہ ہو۔ فصل اچھی خاصی ہوئی، مگر ہمیں جو حصہ دیا گیا وہ بہت کم تھا۔ بمشکل گزرا ہوا،

زلیخاں کے باپ کی بھیجی ہوئی خرمانیاں اور سوکھا گوشت آڑے آیا۔ ورنہ سردیوں کا آخری مہینہ تو فاقے سے ہی گزرتا۔ خورو نے پریشانی سے سوچا، اب کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانا ہی پڑے گا۔

دوسرے دن پو پھٹتے ہی وہ خامر کے گھر میں تھا۔ خورو کی بات مختصر تھی، مگر ٹھوس، اس نے سادگی اور وقار سے اپنا حصہ مانگا تھا۔ خامر اور اس کے غراتے بیٹے اسے ذرا بھی خوف زدہ نہ کر سکے۔ پانچ دن اور ہیں۔ آپ بڑے ہیں۔ خود ہی بٹوارہ کر دیجیے۔ مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہو گا۔ میں نہیں چاہتا کہ گھر کی بات باہر نکلے۔ اور گاؤں والے ہمارے لئے فیصلے کو آئیں۔ خورو نے خلوص سے کہا۔

واپسی پر وہ سوچ رہا تھا، میں نے ٹھیک ہی تو کہا تھا، حق کی بات ہے پھر خامر اور اس کے بیٹے مجھ سے کیوں خفا تھے؟

یہ تو خامر کو بھی پتا تھا کہ وہ خورو اور اس کے بیٹے سے زیادہ دیر بیگار نہ لے سکے گا۔ خامر نے سوچا، بٹوارا کبھی نہ کبھی تو ہونا ہی ہے۔ پھر ساری بات ابھی میرے ہاتھ میں ہے۔ جیسا فیصلہ چاہوں کروں، جیسی زمین چاہوں خورو کو دوں، وہ ہر بات پر راضی ہو جائے گا۔ اسے اچھی بری زمین کی عقل ہی نہیں، جو دوں گا وہی لے، لے گا۔ اگر گاؤں والے بیچ میں آکودے تو معاملہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔

اور پھر دوسرے ہی دن زمین کو تقسیم کر دیا گیا۔خورو کو چٹانوں سے اٹی، درختوں سے خالی، جھاڑیوں سے پر زمین دی گئی۔بس چند ہی کھیت اچھے تھے، ان تک بھی پانی کی نالیاں درست نہ بہتی تھیں۔ان کے اٹ ٹوٹے ہوئے تھے۔باقی زمین کچھ زیادہ ہی تیکھی ڈھلوان پر تھی۔بنے باندھنے اور کھیت نکالنے کے لئے کچھ زیادہ ہی مشقت درکار تھی۔اس لئے خورو اور خامر کے باپ نے اپنی جائیداد کے اس حصے پر زیادہ توجہ نہ دی تھی۔

خورو نے اسے بھی بخوشی قبول کر لیا۔بیٹے کو سمجھا بجھا کر چپ کرا دیا، اور دن رات کام پر لگ گیا۔وہ مخلص تھا محنتی تھا۔لوگ اسے پسند کرتے تھے۔اس کے عزیزوں نے فالتو وقت میں اس کی مدد کی۔چند برس میں ہی زمین اپنا رنگ دکھانے لگی۔کھیتوں میں خوب فصلیں اگنے لگیں۔پانی کی نالیاں اور راٹ بن گئے۔خرمانیوں کے پودے پیڑ بننے لگے۔اب کے تو ان سے فصل کی بھی امید تھی۔خورو کی سادگی اس کے کام آئی۔اس نے اچھے مشوروں پر عمل کیا۔

خرمانی کی پہلی فصل شاندار تھی۔اس نے شکریہ کے طور پر ہر ایک کو تحفے میں خرمانیاں بھیجیں۔بہترین قسم کی خرمانیوں سے لدی ٹوکری جب خامر کے گھر پہنچی تو وہ ٹھٹکا اور اسے پھر خورو یاد آیا۔

جب سے بٹوارہ ہوا تھا وہ خورو کے گھر نہ گیا تھا۔اور نہ ہی اس کی زمین کا چکر لگایا تھا۔اس نے بہت ہی عمدہ زمین لی تھی۔خورو کی سادگی سے خوب فائدہ اٹھایا تھا۔خود منصف بن کر وہ ایک تہائی حصہ غصب کر چکا تھا۔پھر گاؤں والوں سے اس بات کو چھپانے کے لئے اس نے کئی حیلے کیے تھے۔باڑیں اونچی لگائی تھیں۔

جگہ، جگہ خرمانی کے پودے اگائے تھے۔ درخت زیادہ ہوں تو زمین کم دکھائی دیتی ہے۔ اس نے سوچا۔

مگر گاؤں والے تو اپنے کاموں میں مصروف رہے، کیونکہ خورو نے خامر کے ہر فیصلے کو دل سے قبول کرلیا تھا۔ کوئی شکایت نہ کی تھی۔ لہٰذا انھوں نے بھی کسی چیز پر غور نہ کیا۔

چند فصلوں کے اٹھ جانے کے بعد خامر مطمئن ہوگیا۔ اب وہ خورو سے حاصل کیے ہوئے حصے کو ہڑپ کر چکا تھا۔ اس نے مسرور ہو کر چند کھیتوں کو دیکھا۔ ہوا سر سرائی تو چند خرمانیاں دھپ سے اس کے قدموں میں آن گریں۔ تم سب اب میری ہو، اس کا سینہ تن گیا۔

بات پرانی ہوگئی ہے۔ خورو نے دوستی کا ہاتھ پھر سے بڑھایا ہے۔ وہ ویسے ہی بیوقوف اور کمزور سا ہے۔ صرف ایک بیٹے والے کا زور ہی کتنا ہوتا ہے۔ پھر بھلا میرے سات بیٹوں سے مقابلہ کرسکتا ہے وہ۔ ایسے کم عقل بھائی کے بھی بہت فائدے ہیں۔ اس سے اب ملنا چاہیے۔ خامر نے ارادہ کیا۔

خامر درختوں کی اوٹ سے باہر نکلا تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ یہ وہ زمین نہ رہی تھی، جو خامر نے بیکار سمجھ کر خورو کو دی تھی، چٹانوں اور گرے پڑے پتھروں کی جگہ لہلہاتے کھیت تھے، ان کو سیراب کرتی پانی کی نالیوں کا بندوبست موزوں تھا، بنے اور اٹ صفائی سے بنے ہوئے تھے۔ پہاڑوں کو کاٹ اور ٹیلوں کو ہموار کر کے کھیت بنائے جا چکے تھے۔ ان کی زرخیزی عیاں تھی۔ خرمانی کے درختوں میں بھی اضافہ کیا جا چکا تھا۔ سرسبز کھیت، جا بجا شفاف پانی کی نالیاں، چلنے کے لئے راستے، خورو کا صاف ستھرا

گھر.... اور پھر کس اعتماد اور مسکراہٹ سے اس نے خامر کو خوش آمدید کہا ۔..... خامر تو دھک سے ہو گیا۔

خورو اتنے تھوڑے عرصے میں اتنی ترقی کر جائے گا کہ برابری کا امکان پیدا ہونے لگے، خامر نے یہ تو سوچا ہی نہ تھا، اس کا انداز بدل گیا، وہ خفگی کا تاثر لئے کچھ دیر خورو کے آنگن میں رکا، اُکھڑی، اکھڑی سی چند باتیں کیں، اور واپس ہولیا۔

یہ کیسی ملاقات ہے۔ اتنے سالوں کے بعد آئے بھی تو ایسے، جیسے ناراض ہوں، اس سے تو نہ ہی آتے تو اچھا تھا۔ خورو کے بیٹے نے کہا۔

جلد ہی خامر نے اپنی ناراضگی کا اظہار کر دیا، زمین کا بٹوارہ پھر سے کیا جائے گا۔ تم بہتر اور زیادہ زمین کے مالک بن بیٹھے ہو۔ میرے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے، میں تمہیں چھوٹا سمجھ کر خاموش رہا، میری زمین کم ہے اور کمزور بھی۔ میرے سات بیٹے ہیں، یہ صورت حال میرے لئے بہت تکلیف کا باعث ہے۔ تم محض ایک بیٹے کے باپ ہو، پھر بھی اتنی بہ تسی زمین ہضم کر گئے اور تمہیں خیال تک نہ آیا۔

ہمیں انصاف چاہیے اور انصاف ہو کر رہے گا۔ خامر کا بڑا بیٹا ہاتھ ہلا، ہلا کر غرایا ۔اس کے ہاتھ بھی عجیب تھے، انگوٹھے کے ساتھ ایک اور بٹن نما چھوٹی سی انگلی تھی ۔جس کا ناخن پچکا ہوا تھا۔ جب وہ غصہ میں ہاتھ ہلاتا تو خورو اس کی بدکلامی سے بے نیاز اس کے اجنبی ہاتھ کو دیکھا کرتا تھا۔ اور اسے یوں محسوس ہوتا، جیسے وہ کسی جانور کا پنجہ ہو۔

سب نے اتنا واویلا مچایا کہ خورو پریشان ہو گیا، شاید وہ سچ ہی کہتا ہے، غلطی غالباً مجھ سے ہوئی ہے۔ بات تو ساری انصاف کی ہے، پھر اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ زمین

کا بٹوارہ پھر سے کر لیتے ہیں ۔مگر اب کے بیچ میں ایک ضامن ہونا چاہیے، جو منصف ہو اور اپنی بات کا پکا ہو ۔تا کہ اگر چند سال کے بعد پھر سے جھگڑا ہوا اٹھے تو وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے ۔اب کی تقسیم پکی اور مستقل ہونی چاہیے ۔خورو نے تہیہ کیا اور خامر کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا ۔

تو پھر ضامن زمین کو بنا لیتے ہیں خامر نے کہا ۔

خورو کے چہرے پر تذبذب دیکھ کر خامر بولتا چلا گیا، زمین سے بہتر ضامن کوئی نہیں ۔یہی تو پرورش کرتی ہے ۔پالتی ہے، دیتی ہے ۔یہ انصاف کیسے نہیں کرے گی ۔انصاف تو اس کی گھٹی میں ہے ۔

خورو مطمئن ہو گیا، اب زمین جانے اور اس کا فیصلہ، اس کے دل کا سارا بوجھ ہلکا ہو گیا ۔صبح زمین جو فیصلہ کرے گی وہ اسے بخوشی قبول کر لے گا ۔اس رات خورو بے فکر سویا ۔صبح ہونے میں ابھی چند گھنٹے باقی تھے، آسمان صاف تھا، تارے ماند تھے، اور فضا ہلکی چاندنی میں نہائی ہوئی تھی ۔ایسے میں خامر کے گھر کا دروازہ کھلا، وہ اور اس کا بڑا بیٹا کدال لئے باہر نکلے ۔تو ان کے قدموں کی آہٹ سے ان کے دروازے کے قریب اگی انگوروں کی بیل چونک گئی ۔

یہ کیا ہے خوشوں نے سر اٹھایا ۔ان کی نیتوں کو بھانپتے ہی انگور شرما گئے ۔انھوں نے پتوں میں منہ چھپا لیا ۔پھر جہاں جہاں ان کے قدم پڑے فضا میں ایک ارتعاش دوڑتا گیا ۔درخت اور بوٹے چونک اٹھے، خرمانیاں رو پڑیں ۔

ایسا نہ کرو انھوں نے التجا کی، اس میں برکت نہیں ۔وہ سسکیں ۔مگر ان کا مفہوم کون سمجھتا تھا، یہاں تو لالچ حواس پر سوار تھی ۔اور عقل حسد کی آگ میں پھنک رہی تھی ۔

خورو کے کھیت شروع ہو گئے، پگڈنڈیوں نے غیر قدموں کے بوجھ کی شکایت کی۔اٹ مچل گئے۔پتھر چٹنے اور جھاڑیوں نے خار پھسلا کر اور خامر کے لباس کو الجھا کر روکنا چاہا۔چاند نے بادلوں کی آڑ لے کر روشنی گل کر دی۔

تا کہ وہ یہ غلط کام نہ کر سکے مگر خامر کچھ نہ سمجھا، جب دل اتنا سخت ہو جائے تو ہلکی دستک کہاں سنائی دیتی ہے۔

اس نے جب کدال اٹھائی تو زمین نے اپنا سینہ سخت کر لیا۔مگر بے رحم نے وار پر وار کیے۔.....اپنے ہی ضامن کے سینے پر وار۔جب ایک اچھا بڑا سوراخ تیار ہو گیا۔تو اس نے اپنے بیٹے کو نیچے اتر جانے کا حکم دیا۔یہاں چھپ جاؤ میں تمہارے گرد پتھر اور اوپر جھاڑیاں رکھ کر ہلکی مٹی سے تمہیں چھپائے دیتا ہوں، ویسے بھی ہم زیادہ نزدیک نہیں آئیں گے۔تمہارا جواب بلند ہونا چاہیے۔اسے سنتے ہی خورو مطمئن ہو جائے گا۔پھر میں اس کے جاتے ہی آ کر تمہیں نکال لوں گا۔

اس کا بڑا بیٹا شرارت سے مسکرایا الوداعی انداز میں اپنا پنجہ نما ہاتھ ہلایا۔اور سوراخ میں اتر گیا۔خامر نے کمال احتیاط سے سوراخ کو ڈھانپا، جب وہ آخری جھاڑ رکھ رہا تھا۔تو اس کے بیٹے نے سر اٹھا کر ہنستی آنکھوں سے اسے دیکھا۔خامر انہیں آنکھوں کا تاثر دل میں لئے، کدال کاندھے سے لگائے تیز، تیز قدموں سے گھر کی طرف روانہ ہوا۔

پو پھٹتے ہی دونوں بھائی خورو کی زمین میں خامر کے بنائے ہوئے سوراخ سے ذرا فاصلے پر تھے۔خورو کا ایک بیٹا اور خامر کے چھ بیٹے اس کے ساتھ تھے۔بڑا کہاں ہے خورو نے پوچھا؟

اس کی طبیعت ٹھیک نہیں، گھر میں آرام کر رہا ہے۔خامر نے جواب دیا،خامر کے اندر ایک طلاطم تھا،مرتعش لہریں اس کے وجود کو جکڑے ہوئے تھیں،اور وہ ہوس کے پھندوں میں الجھا ہوا تھا،وہ شدت سے یہ خواہش کر رہا تھا۔کہ اس کی ترکیب کامیاب ہو۔دوسری طرف خورو تھا مطمئن اور پرسکون۔اس کی نہ کوئی امید تھی نہ وابستگی،نہ خواہش،سارا فیصلہ اس نے زمین پر چھوڑ دیا تھا۔اب وہ آزاد اور ہلکا پھلکا کھڑا تھا۔اپنے ضامن پر اسے اعتماد تھا۔زمین دھوکا کبھی نہیں دیتی،اسی ایمان پر وہ قائم تھا۔تم پوچھو خامر کی آواز لرزی۔سوال خورو نے ہی کیا؟ ہم میں سے زمین کس کے پاس زیادہ ہے؟ اے زمین،اے ہماری ضامن بتا،اس کی پر اعتماد اور حلیم آواز گونجی۔

کچھ لمحہ خاموشی رہی۔ان چند ساعتوں میں خامر پر جیسے ایک مدت گزر گئی۔پھر ایک بھاری لرزتی آواز سنائی دی،خورو کے پاس!

یہ واضح آواز سب نے سنی۔اس میں لرزش کو سب نے محسوس کیا۔اس لرزش کے ساتھ ان کے وجود بھی تھرائے،فضا کانپی۔اشجار لہرائے۔اس لمحہ زمین خود بھی لرزی تھی۔

خورو نے اسے سنا اور تسلیم کر لیا۔فیصلہ سننے کے بعد بھی اس کا سکون اور اعتماد برقرار رہے۔انصاف کو ماننا ہی پڑتا ہے۔اسی میں سب کی عافیت ہے۔یہ اس کے اندر کی سوچ تھی۔

خامر کی نگاہیں خورو کا تعاقب کرتی رہیں۔جوں،جوں خورو دور ہوتا گیا،خامر کا حوصلہ واپس آتا گیا۔اپنی فتح کا احساس آہستہ،آہستہ اس کے ذہن پر چھانے لگا

۔مگر اس جیت کے باوجود وہ اس اعتماد سے محروم تھا، جو خورو کی تنی پشت سے عیاں تھا ۔جب خورو گھر پہنچ گیا تب خامر نے نگائیں لوٹائیں، اور جھاڑیوں کے نیچے کھدے گڑھے کو دیکھا، پھر خامر نے سوراخ میں سے اپنے بیٹے کو باہر نکالنے کا سلسلہ شروع کیا ۔مٹی ہٹائی جھاڑیاں دور کیا، پتھر پرے رکھے، بیٹے کو آواز دی، اور مدد کے لئے ہاتھ نیچے لٹکایا، مگر سوراخ خالی تھا، اس کا بیٹا وہاں نہ تھا، وہ کچھ دیر کے لئے گھبرایا، مگر اس نے سوچا وہ کہاں جا سکتا، یہیں کہیں ہوگا۔اس نے بیٹے کو آواز دی ۔تم کہاں ہو بیٹا ؟

یہاں ہوں، ذرا دور کھیت کے دوسری طرف سے آواز آئی، خامر لپک کر وہاں پہنچا، زمین سپاٹ تھی، اسے لگا زمین کے اندر سے آواز آئی ہو۔اس نے زمین کھود ڈالی، مگر کچھ نہ نکلا۔

سارا دن خامر اور اس کے چھ بیٹے آوازیں دیتے اور زمین کھودتے رہے، انھوں نے کھیت کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک سارا ہی کھود ڈالا، مگر خامر کو اپنا بڑا بیٹا پھر نہ ملا، بس اس کی آواز ہی اس کے کانوں میں گونجتی رہی ۔وہ رات خامر پر ایک عذاب کی رات تھی، اپنے لادلے بیٹے کی ہنستی آنکھوں کی یاد کی وحشت اسے گھیرے رہی ۔صبح ہوئی تو اس کے لئے نئی قیامت برپا ہوگئی، اس کے سارے بیٹے بستروں پر مردہ پائے گئے ۔

اس کے بعد خامر نہ کبھی گھر سے نکلا، نہ کبھی زمین کا رخ کیا، اسے چپ لگ گئی تھی، جوں، جوں وقت گزرتا گیا، وہ کھانے پینے سے بھی رہ گیا، خورو نے ایسے غم کے وقت اپنے بھائی کی ہر طرح سے دل جوئی کی کوشش کی، مگر چھوٹے بھائی کی قربت اس کے اعصاب پر بہت برا اثر ڈالتی، اُس کی سانس رکنے لگتی اور اس پر نزع

کی سی کیفیت طاری ہو جاتی، اسی لئے عزیزوں کے سمجھانے پر خورو نے خامر کے گھر جانا چھوڑ دیا،

خورو پر وہ کھیت اب بھاری تھا، وہاں کی عدالت کے انصاف نے اس کے بھائی کو سنگین سزا دی تھی، اس نے وہاں کے راستے کو ہی بند کرنے کا سوچا، کہ وہاں کوئی گزرگاہ ہی نہ رہے، وہ کدال لے کر سارا دن اس کھیت میں مصروف رہا، اس نے پتھروں اور جھاڑیوں سے راستہ بند کیا، پانی کی نالیوں کا رخ موڑا، پھر نالیاں بند کیں۔ جب وہ آخری نالی بند کر رہا تھا، تو اسی سوراخ میں سے جہاں اس کا بھتیجا غائب ہوا تھا، ایک جانور نکلا، اس کے چھوٹے، چھوٹے چار پاؤں تھے، گول سا منہ تھا، اور بالوں سے مرصع لمبی دم، اس کی کھال بھورے رنگ کی تھی۔ خورو ٹھٹھک گیا، اس نے اس طرح کا جانور پہلے کبھی نہ دیکھا تھا، مگر وہ جانور ایک پالتو کی طرح اس کے قدموں میں لوٹنے لگا، اس کے پاؤں چاٹنے لگا، جانور نے دم ہلاتے ہوئے آنکھیں اٹھا کر اسے یوں دیکھا، جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو، خورو کچھ دیر کے لئے ٹھٹھکا، مگر اسے چھوٹے سے جانور کی آنکھوں میں بے بسی اس سے برداشت نہ ہو سکی۔ اس نے کدال چھوڑ دی، اسے اٹھا لیا اور قریب ہی پتھر پر بیٹھ گیا، جانور کو گود میں لٹا لیا، اور اس کی پشت سہلانے لگا، جانور نے سر خورو کی گود میں رکھ دیا، اور جیسے ہچکیوں سے رو دیا۔

جب خورو اٹھا تو جانور نے ایک اور مانوس حرکت کی، اپنا پنجہ اٹھا کر خورو سے ہاتھ ملانا چاہا۔ اس کے پنجے کی پانچ انگلیاں تھیں، انگوٹھے کے ساتھ ایک بٹن سی گول سی انگلی تھی۔ جس کا ناخن پچکا ہوا تھا۔ جاتے، جاتے خورو نے پلٹ کر دیکھا تو وہ اسے غمناک مگر ہنستی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا،

خامر کے مرنے کے بعد خورو نے اس کی زمین کو جوں کا توں رہنے دیا۔ کہتے ہیں پردیس سے ایک شخص داتو سنگھ کو لایا گیا۔اس نے خامر کی زمین آباد کی،ہنزہ کے لوگ جب بھی جنگ پر روانہ ہوتے تو داتو سنگھ کی اولاد میں سے کوئی ایک جھنڈا اٹھاتا،بلتیت میں آج کل دو نسلیں آباد ہیں،خورو کی اولاد بن کو خوروکوٹ کہتے ہیں ۔اور داتو سنگھ کی اولاد بن کو داتو سنگھ کوٹ کہتے ہیں۔

خامر کے بیٹے جس سال مرے،اسی سال ہنزہ سے بہت دور،مسگر خان والی،قلعہ سے آگے بلند چراگاہوں میں،قرکیش،اور مٹا کا تلگ،قاراچوکر،تگ دم باش کی وادیوں میں اوران دروں کے گرد جو کشمیر کو جاتے ہیں۔ایک عجیب سا جانور نمودار ہوا،یہ جانور زمین کے اندر کیے گئے سوراخوں اور تنگ غاروں میں چھپ کر رہتا ہے ۔سال مین صرف چار ماہ کے لئے باہر نکلتا ہے۔گھاس اور کھمبیوں وغیرہ پر گزرا کرتا ہے۔اپنی خوراک کا ذخیرہ نہیں کرتا۔اپنی نشو نما کے لئے کسی اور زندہ جانور کا شکار نہیں کرتا۔ساری سردیاں تہہ زمین بھوکا سویا رہتا ہے۔ہنزہ کے لوگوں کا کہنا ہے کہ خامر کی اولاد مرنے کے بعد اس جانور میں ڈھل گئی۔اسے MARMOT کہتے ہیں۔یہ آج کل بھی ان پہاڑوں پر پایا جاتا ہے۔

--------The End----ختم شد--------